Regd. L. No.7243

Phone, 80800

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

نومبر 1974

اس پرچہ میں

"تین نمازوں اور نو دن کے روزوں"

کے

پسِ پردہ کیا ہے؟

شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی - گلبرگ - لاہور ۹

قیمت فی پرچہ ایک روپیہ - پچاس پیسے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر!

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

قیمت فی پرچہ	ٹیلیفون	بدل اشتراک
۱½ ڈیڑھ روپیہ	۸۰۸۰۰ خط وکتابت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور	سالانہ پاکستان ــــ ۱۵ روپے سالانہ غیر ممالک ــــ ۱½ پونڈ
نمبر ۱۱	نومبر ۱۹۷۴ء	جلد نمبر ۲۷

فہرست

(۱) لمعات ــــ ۲

(۲) ختمِ نبوت اور تحریکِ احمدیت* ــــ ۸

(۳) استقبالیہ طلوعِ اسلام کنونشن - (محترم پرویز صاحب) ــــ ۹

(۴) زمین کے ہنگامے ــــ (محترم حسن عباس رضوی صاحب) ــــ ۳۳

(۵) ہندو کے عزائم ــــ ۳۸

(۶) عبدالحمید صدیقی صاحب کی خدمت میں ــــ ۴۲

(۷) نقد ونظر۔ (اقبال اور قادیانی) ــــ ۴۷

(۸) "تین نمازیں اور نو دن کے روزے" (محترم محمد اسلام صاحب) ــــ ۴۹

ایڈیٹر- محمد خلیل، ناشر- سراج الحق، مقامِ اشاعت ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور، پرنٹر- محمد محسن، مطبوعہ- لاہور آرٹ پریس ۱۰ انارکلی لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

بات چل نکلی ہے اب دیکھیں کہاں تک پہنچے

اس ماہ کے لمعات کو ہم ایک خبر پر مشتمل رکھنا چاہتے ہیں جو روزنامہ نوائے وقت (لاہور) کی ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۴ء کی اشاعت میں شائع ہوئی ہے۔ اور وہ من وعن یہ ہے۔

"اسکولوں میں اسلامیات کی تعلیم کے نصاب سے متعلق آج سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کے مابین متفقہ فیصلہ ہو گیا۔ یہ متفقہ فیصلہ کابینہ کی اس کمیٹی کی مساعی سے ہوا جو وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو نے اس مقصد کے لئے قائم کی تھی اور جو وفاقی وزیر تعلیم مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ اور وفاقی وزیر تجارت، پیداوار مسٹر رفیع رضا پر مشتمل تھی۔ کمیٹی اجلاس آج صبح لاہور میں منعقد ہوا۔ جس میں شیعہ فرقہ کے نمائندگان نے بھی شرکت کی۔ مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے آج شام سرکٹ ہاؤس کوئٹہ میں ایک غیر رسمی اجلاس میں اس متفقہ فیصلے کا اعلان کیا اور بتایا کہ پہلی سے آٹھویں جماعت تک شیعہ وسنی طلباء وطالبات کا نصاب مشترک ہوگا البتہ نویں اور دسویں جماعتوں میں شیعہ طلبا الگ نصاب اختیار کرسکیں گے نئے نصاب اگلے سال اپریل سے نافذ کئے جاسکیں گے تاہم شیعہ طلبا کو اس سال بھی نویں اور دسویں میں مجوزہ کتابوں سے امتحان دینے کا اختیار ہوگا۔"

مسٹر پیرزادہ نے اس فیصلے کا اعلان کرتے ہوئے وزیر اعظم بھٹو کا ایک بیان بھی پڑھ کر سنایا۔

وزیر اعظم پاکستان نے اپنے بیان میں کہا "مجھے اس اعلان سے حد درجہ مسرت ہوئی ہے کہ آج صبح لاہور میں شیعہ علماء اور کابینہ کی کمیٹی کے مابین تعلیمی اداروں میں طلبہ کے لئے اسلامیات کے نصاب کے سلسلے میں مکمل اتفاق ہو گیا۔ یہ فیصلہ شیعہ اور سنی علماء کی مشترکہ کمیٹی کی سفارشات کی روشنی میں ہوا ہے۔ یہ مسئلہ عرصہ سے شیعہ فرقے میں تشویش کا باعث بنا ہوا تھا اس لئے عوامی حکومت کا یہ ایک اور کارنامہ ہے جس نے ماضی کے تمام ناگوار ورثوں کو مستحسن اور نئی شکل دے کر ملک کو قومی اتحاد اور یگانگت کے راستے پر گامزن کر دیا ہے۔ مجھے پوری توقع ہے کہ شیعہ اور سنی علماء، وزارت تعلیم کے نمائندوں کے ساتھ اشتراک عمل کر کے اسلامیات کے لئے ایسے نصاب کی تشکیل کا کام آئندہ تعلیمی سال شروع ہونے سے پہلے مکمل کر لیں گے جو دونوں فرقوں کے لئے قابل قبول ہو۔" اسلامیات کے نصاب سے متعلق لاہور کے اجلاس کے فیصلے حسب ذیل ہیں۔

(۱) تمام سکولوں میں پہلی جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک تمام طلبا وطالبات مشترکہ نصاب کے مطابق اسلامیات پڑھیں گے جو حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہوگا۔ (۱) قرآن حکیم اور نماز۔ (۲) سیرۃ النبیؐ۔ (۳) اخلاقیات۔

(ب) نویں اور دسویں جماعتوں کے لئے شیعہ اور سنی طلبا اور طالبات کے لئے علیحدہ علیحدہ نصاب ہوں گے۔

(۱) عبادات ۔ (۲) سوانح عمریاں۔

(ج) نویں اور دسویں جماعت کے طلبا و طالبات اپنے اپنے عقیدے اور مرضی کے مطابق کورس اور پریڈ اختیار کر سکیں گے۔

(د) شیعہ اور سنی علماء کا ایک ورکنگ گروپ اسلامیات کے نصاب تجویز کرے گا اور اس امر کا خیال رکھے گا کہ ان میں کوئی ایسا مواد نہ ہو جس سے دونوں میں سے کسی فرقے والوں کی دلآزاری ہو۔

(س) نویں اور دسویں جماعتوں میں شیعہ طالب علموں کے لئے فوراً ڈاکٹر ظہیر حسین کی کتابیں مروج کر دی جائیں گی مگر حکومت موجودہ تعلیمی سال میں ان کی تدریس کا انتظام نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ امتحانات سر پر ہیں۔ اس لئے شیعہ طلبا طالبات دونوں میں سے کسی بھی نصاب کے مطابق جوابات لکھ سکیں گے۔

(س) پہلی اور آٹھویں جماعتوں اور نویں اور دسویں جماعتوں کے لئے نئے سلیبس ۱۹۷۵ء کے تعلیمی سال سے شروع کئے جائیں گے۔ اگر اس وقت تک نئے نصاب تیار نہ ہو سکے تو شیعہ طالب علم فرزند رضا اور ذکی حسین فاروقی کی کتاب سے استفادہ کر سکیں گے۔

مسٹر عبدالحفیظ پیرزادہ نے کہا کہ عوامی حکومت نے ایک اور مسئلہ حل کر لیا ہے جو پچھلے دس سال سے الجھن کا باعث بنا ہوا تھا۔ کیونکہ آج کے فیصلے پر دونوں فرقوں نے لبیک کہا ہے۔ شیعہ فرقے نے اس کے متعلق لگاتار احتجاج شروع کر رکھا تھا۔ اور ۲۷ اکتوبر کو "یوم احتجاج" کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لئے اس کے حل کی اشد ضرورت تھی۔ اس سوال کے جواب میں کہ یہ فیصلہ صرف میٹرک تک کی سطح تک کیوں محدود رکھا گیا ہے، مسٹر پیرزادہ نے کہا کہ کالجوں میں بھی طلبا شیعہ یا سنی نصاب میں سے جو چاہیں گے اختیار کر سکیں گے۔

اخباری نمائندوں کے سوالات کے جواب دیتے ہوئے وفاقی وزیر تعلیم نے بتایا کہ یہ فیصلہ اہل تشیع کے تین بڑے بڑے گروپوں اور علماء نے کیا ہے جن کی لاہور کے اجلاس میں نواب مظفر علی قزلباش، مسٹر مظفر علی شمسی اور سابق جج ہائی کورٹ مسٹر جمیل حسین رضوی نے نمائندگی کی۔ اب شیعہ حضرات ۲۷ اکتوبر کو اسلامیات کے علیحدہ نصاب کے لئے "یوم احتجاج" نہیں منائیں گے۔ انہوں نے کہا کہ کالجوں میں یہ مضمون خود اختیاری نوعیت رکھتا ہے۔"

قارئین کو شاید اس پر تعجب ہو کہ ہم نے (خلافِ معمول) اپنے لمعات کو ایک خبر کی اشاعت بلا تبصرہ تک محدود رکھا۔ بات ہے بھی باعث تعجب، لیکن اسے ایسے ہی رہنا چاہیئے۔ اخبار میں شائع شدہ خبر کی عمر ایک دن کی ہوتی ہے لیکن جب یہ طلوعِ اسلام میں چھپ جائے گی تو محفوظ ہو جائے گی۔ اور اگر آج کی یہ پیش پا افتادہ سی خبر، کل کو تاریخ کا ایک اہم موڑ بن جائے، تو اُس وقت کے مورخ کو اس کی تلاش میں زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑے گی۔ ہر تناور درخت کی ابتدا ایک ننھے سے بیج سے ہوا کرتی ہے۔

—— (۰) ——

(۲)

ایک پرانا شعر ہے :-

خیالِ عشق بتاں میں نصیرؔ پیٹ کر　　گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

یوں تو سانپ کی لکیریں گذر جانے والے سانپ کے آثارِ باقیہ سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ لیکن بعض اوقات یہی لکیریں، خود سانپ سے بھی زیادہ خطرناک بن جاتی ہیں۔ یہی کیفیت یہاں "احمدیوں" سے متعلق فیصلہ کی ہوئی ہے۔ اس فیصلہ پر ملک میں جشنِ مسرت منایا گیا۔ حکومت نے اطمینان کا سانس لیا کہ جو مسئلہ نوے سال سے لاینحل چلا آرہا تھا وہ نہایت حسن و خوبی سے طے پا گیا۔ اور ملک ان خطرات سے محفوظ ہو گیا جن میں یہ گھرا ہوا نظر آرہا تھا۔ کسی نے اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ اس فیصلہ کے نتائج و عواقب کیا ہوں گے اور ان سے کیسے نمٹا جائے گا۔ نتیجہ یہ کہ ملک میں مختلف مقامات پر فسادات کے شعلے ابھرنے شروع ہو گئے ہیں۔ ہم اس بحث میں نہیں الجھنا چاہتے کہ یہ شعلے، فتنہ پرور، تخریب پسند عناصر کی طرف سے بھڑکائے جا رہے ہیں یا عوام کے اندر سے از خود ابھر رہے ہیں۔ اس کی تحقیق و تفتیش سے صحیح نتیجہ پر پہنچنا حکومت کا کام ہے جس کے پاس اس کے لئے ضروری ذرائع موجود ہیں۔ ہم تو صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ اس فیصلہ کے عواقب و اثرات کو درخورِ غور و فکر نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے کہ ملک میں اس قسم کے انتشار کے امکانات پیدا ہو گئے۔ مسلمانوں کا کہنا یہ ہے کہ جب "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا تو انہیں ملک میں، دیگر غیر مسلموں کی طرح رہنا چاہیئے۔ دیگر مسلموں (ہندوؤں، پارسیوں، عیسائیوں) کی اپنی اپنی الگ عبادت گاہیں ہیں۔ ان کا طریقِ عبادت مسلمانوں سے جداگانہ ہے۔ ان کے تیوہار مختلف ہیں۔ رسوم و رواج مختلف ہیں۔ حتیٰ کہ نام تک بھی مختلف ہیں۔ لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ "احمدی" بدستور مسجدوں میں آتے ہیں (خواہ وہ ان کی اپنی مسجدیں ہی کیوں نہ ہوں) اذانیں دیتے ہیں۔ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ہمارے ہی تیوہار مناتے ہیں۔ یعنی اس فیصلہ سے ان کی پہلی اور بعد کی حالت میں کچھ بھی فرق نہیں آیا، تو ان کے جذبات مشتعل ہو جاتے ہیں، یا تخریب پسند عناصر اس صورتِ حالات سے فائدہ اٹھا کر ان کے جذبات کو مشتعل کر دیتے ہیں۔

دوسری طرف جماعت "احمدیہ" ہے۔ انہوں نے ابھی تک اس فیصلہ کے متعلق اپنے ردِعمل کا بصراحت اعلان نہیں کیا۔ مبہم باتیں کئے جاتے ہیں۔ یہ فیصلہ ۷ ستمبر کو ہوا تھا۔ اس وقت ہمارے سامنے ۴ اکتوبر کا اخبار الفضل ہے جس میں ربوہ جماعت کے سربراہ، مرزا ناصر احمد کا ۱۳ ستمبر ۱۹۷۴ء کا خطبہ جمعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں انہوں نے کہا ہے کہ ان سے دو سوال پوچھے جا رہے ہیں۔ ایک یہ کہ "جو قرارداد پاس ہو چکی ہے، اس پر جماعتِ احمدیہ کے خلیفۃ المسیح الثالث کا تبصرہ کیا ہے"؟ اور دوسرا یہ کہ "اس قرارداد کے پاس ہونے کے بعد جماعتِ احمدیہ جس کا صحیح نام حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے "احمدیہ فرقہ کے مسلمان" رکھا ہے، تو اب احمدیہ فرقہ کے مسلمانوں کا ردِعمل کیا ہونا چاہیئے"؟ انہوں نے پہلے سوال کے جواب میں کہا کہ:

اس کے متعلق اس وقت تو میں اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ

NO - COMMENT

کوئی تبصرہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس پر تبصرے سے قبل بڑے غور اور تدبر کی ضرورت ہے اور مشورے کی ضرورت ہے۔ پس مشورے اور تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد پھر میں جماعت احمدیہ کو بتاؤں گا کہ جو پاس ہوا ہے وہ اپنے اندر

کتنے پہلو لیے ہوئے تھا۔ کیا بات صحیح ہے، اور کیا بات صحیح نہیں ہے۔ بہرحال اس وقت اس پر کوئی تبصرہ نہیں ہے۔ اس کے لئے آپ کچھ دن اور انتظار کر لیں۔ کوئی جلدی بھی نہیں ہے، اصل تو یہ ہے کہ آپ کو حقیقت معلوم ہو جائے۔ اس لئے حقیقت کو ابھرنے دیں۔ حقیقت کو (UNFOLD) ہونے دیں۔ اس کو پتیاں نکالنے دیں۔ پھر اس کے اوپر تبصرہ بھی آجائے گا۔

دوسرے سوال کے جواب میں انہوں نے بہت سی غیر متعلقہ باتیں کرنے کے بعد کہا کہ:

> جہاں تک کسی کے مسلم یا غیر مسلم ہونے کا سوال ہے، تو میں شروع سے کہہ رہا ہوں۔ اس قرارداد سے بہت پہلے سے کہتا چلا آرہا ہوں کہ جس شخص نے اپنا اسلام لاہور کی مال (روڈ) کی دکان سے خریدا ہو، وہ تو ضائع ہو جائے گا۔ لیکن میں اور تم، جنہیں خدا خود اپنے منہ سے کہتا ہے کہ تم (مومن) مسلمان ہو، تو پھر ہمیں کیا فکر ہے۔ دنیا جو مرضی کہتی رہے۔ ہمیں فکر ہی کوئی نہیں۔ باقی تبصرے بعد میں ہوتے رہیں گے۔

اس سے دو باتیں واضح ہیں۔ ایک یہ کہ وہ اس فیصلہ کو حکومت پاکستان کی طرف سے نافذ کردہ قانون نہیں سمجھتے، اسے "قرارداد" کہتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ اپنے آپ کو بدستور مسلمان سمجھتے اور قرار دیتے ہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ وہ کشمکش ہے جس کا ہم نے شروع میں ذکر کیا ہے۔

"احمدیوں" کی لاہوری جماعت نے اپنے آرگن "پیغام صلح" کی ۹/ اکتوبر کی اشاعت میں اس فیصلہ کے متعلق سیر حاصل بحث کی ہے، اور کہا ہے کہ

> قرآن و حدیث، ائمہ کرام اور فقہائے اسلام کے ان صریح احکامات کے ہوتے ہوئے کیا قومی اسمبلی یا مسٹر بھٹو کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کلمہ پڑھنے والوں کو، نماز، روزہ اور تمام ارکان اسلام پر عمل کرنے والے لاکھوں مسلمانوں کو یہ کہہ کر دائرہ اسلام سے خارج کر دیں کہ وہ رسول کریمؐ کو خاتم النبیین نہیں مانتے حالانکہ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ سب سے بڑھ کر جماعت احمدیہ لاہور ہی ہے جو حضورؐ کو حقیقی معنوں میں غیر مشروط طور پر خاتم النبیین مانتی ہے۔

یعنی ان کے نزدیک مسٹر بھٹو یا پارلیمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ انہیں غیر مسلم قرار دے دیں۔

یہ ہے "احمدیوں" کا موقف۔

(۰)

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مسئلہ بڑا نازک اور پیچیدہ ہے۔ لیکن جب حکومت نے ایک آئینی اور قانونی فیصلہ کیا ہے تو اس فیصلہ کی رو سے برآمد ہونے والے نتائج و عواقب کا جائزہ لینا اور ان کے متعلق فیصلے کرنا نہایت ضروری ہے۔ زود یا بدیر، حکومت کو یہ فیصلے کرنے پڑیں گے۔ لیکن اس میں جس قدر تاخیر ہو گی، کشمکش بڑھتی جائے گی اور ملک میں انتشار اور فساد کے امکانات قوی تر ہوتے جائیں گے۔

اصل یہ ہے کہ یہ فیصلہ ہماری تاریخ کا منفرد واقعہ ہے۔ اس سے پہلے ہماری مذہبی پیشوائیت اختلافِ عقیدہ کی بنا پر کفر کے فتوے لگایا کرتی تھی، لیکن جن کے خلاف یہ فتاویٰ صادر ہوتے تھے ان کی حیثیت انفرادی ہوتی تھی۔ وہ مسلمانوں کے اندر کوئی الگ اجتماعی تنظیم نہیں ہوتی تھی۔ جن افراد کے خلاف اس قسم کے فتوے صادر ہوتے تھے، یا تو انہیں مرتد قرار دے کر قتل کر دیا جاتا تھا۔ اور یا وہ روپوش ہو جاتے تھے۔ لہذا یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ "ان کی مساجد" کا کیا کیا جائے' یا وہ "عبادت" کس طرح کریں۔ باقی رہا مذہبی فرقوں کا ایک دوسرے کو کافر قرار دینا' تو ان فتووں کی حیثیت شاعری سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی تھی۔ وہ بدستور مسلمان رہتے اور مسلمانوں جیسے شعار اختیار کئے رکھتے تھے۔ ان سے وہ لوگ بھی کچھ تعرض نہیں کرتے تھے جو ان کے خلاف کفر کے فتوے صادر کرتے تھے۔

لیکن حالیہ صورت بالکل منفرد ہے۔ یہاں ایک جماعت ہے جو قریب سو سال سے اپنے آپ کو مسلمان کہتی چلی آرہی ہے۔ انہوں نے اس سو سال کے عرصہ میں، مسجدیں بنائیں، مسجدوں میں، مسلمانوں کی طرح نمازیں پڑھیں، انہی کے تیوہار منائے۔ انہی کے شعار اختیار کئے۔ (ایک محدود دائرہ سے ہی سہی) ان کے ساتھ رشتے ناطے کرتے رہے۔ انہی کے پرسنل لاز کے تابع رہے۔ اس کے بعد مملکت نے انہیں قانوناً غیر مسلم قرار دے دیا۔ (اگرچہ مملکت نے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کہ جیسے یہ درحقیقت تھے۔ یعنی غیر مسلم۔ انہیں ویسا قرار دے دیا، لیکن بایں ہمہ' کہا تو یہی جائے گا کہ مملکت نے انہیں غیر مسلم قرار دیدیا) لیکن وہ اپنے آپ کو غیر مسلم تسلیم کرنے کے لئے تیار نظر نہیں آتے۔ ان کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی آئینی یا قانونی سوال سامنے آئے گا تو اس وقت دیکھا جائے گا، ورنہ ہم جیسے مسلمان پہلے تھے ویسے ہی اب ہیں۔

حکومت کی دشواری یہ ہے کہ اس نے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دے کر ان تمام حقوق کی ضمانت دے دی ہے جو اقلیتوں کو حاصل ہیں۔ ان میں یہ حقوق بھی شامل ہیں کہ ان کے معابد کی حفاظت کی جائے گی۔ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ ان کے عبادت کے طور طریقوں پر کوئی پابندی عاید نہیں کی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے آپ نے دیکھا کہ یہ مسئلہ کس قدر پیچیدہ ہے!

لیکن ہماری تمام دشواریوں اور پیچیدگیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے مملکت کو اسلامی تو قرار دے دیا لیکن عملاً ہمارا نظام سیکولر ہے۔ ہمیں اپنے مسائل کے حل کے لئے، مغربی ڈیماکریسی کے ضوابط اور اقلیتوں کے حقوق کے لئے یو۔ این۔ چارٹر کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ خود اس مسئلہ کے متعلق حکومت نے کہا ہے کہ اسے "عوام کے مطالبہ" کے مطابق حل کیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ یہ اسلام کا تقاضا تھا لیکن اس باب میں بھی ہمیں حکومت کی دشواریوں کا احساس ہے۔ یہاں مختلف فرقوں کا اسلام مختلف ہے۔ اور ان کے اسلام کے تقاضے مختلف۔ حکومت ان دشواریوں سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکے گی کہ وہ "اسلام کے تقاضوں" کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف نہ دیکھے، بلکہ قرآن مجید کی روشنی میں ان کا تعین بھی خود کرے' اور ان کے مطابق پیش آمدہ مسائل کا حل بھی خود دریافت کرے

بہرحال، جہاں تک "احمدیوں" کے ضمن میں فیصلہ کا تعلق ہے، یہ نہایت ضروری ہے کہ اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا جائزہ لے کر، ان کے متعلق بلا تاخیر فیصلہ کیا جائے تاکہ وہ کشمکش دور ہو جو ملک میں انتشار اور فساد کا موجب بن رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس دوران میں حکومت اپنے تمام ذرائع ابلاغ کو کام میں لا کر، عوام کو صورتِ حالات سے آگاہ کرتی رہے اور انہیں بتاتی رہے کہ یہ تمام امور حکومت کے زیرِ غور ہیں۔ اور وہ کامل فکر و تدبر کے بعد، ان کے متعلق قانونی فیصلوں کا اعلان کرے گی۔ یہ "غور و تدبر" کن مراحل میں ہے، اس کے متعلق بھی ساتھ ساتھ اعلانات کئے جانے ضروری ہیں تاکہ عوام کو اطمینان رہے کہ حکومت اس باب میں سنجیدہ (SERIOUS) ہے، اور اس طرح تخریب پسند عناصر کو شورش پھیلانے کا موقعہ نہ ملے۔ حقیقت یہ ہے کہ سلیکٹ کا یہ عمل، فیصلہ کے فوری بعد، شروع ہو جانا چاہیئے تھا۔ اگر ایسا کیا جاتا تو موجودہ ہنگاموں کے امکانات بہت کم ہو جاتے۔

(۳)

جیسا کہ سابقہ اشاعت میں اعلان کیا گیا تھا، طلوعِ اسلام کی سترہویں سالانہ کنونشن ۲۴ ہر لغایت ۲۷ر اکتوبر منعقد ہو رہی ہے۔ تادمِ تحریر جس قدر اطلاعات موصول ہو چکی ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ امسال یہ اجتماع سابقہ اجتماعات پر بھی فوقیت لے جائے گا۔ چونکہ یہ پرچہ، کنونشن کے انعقاد سے پیشتر پریس میں چلا جائے گا، اس لئے کنونشن کی روئداد اس میں شائع نہیں ہو سکے گی۔ اس کے لئے قارئین کو اگلے ماہ کے پرچہ کا انتظار کرنا ہوگا۔ البتہ ہم ان کے اس انتظار کی زحمت کو کم کرنے کے لئے اسی اشاعت میں پرویز صاحب کا استقبالیہ، اور محترم محمد اسلام صاحب کا مقالہ شائع کر رہے ہیں۔ پرویز صاحب کے خطابات میں سے ایک کا موضوع ہے — "مقصود بالذات کیا ہے۔ فرد یا مملکت" — اور دوسرے کا عنوان ہے — "جنسی بدنہادی کا اثر، قوموں کی موت اور حیات پر"۔ انہیں آئندہ اشاعتوں میں شائع کیا جائیگا۔

ہدیۂ تشکر و امتنان

میں اپنے احباب سے اکثر کہتا رہتا ہوں کہ وہ عید کارڈز کی ترسیل کا تکلف اور اسراف نہ فرمایا کریں لیکن اسکے باوجود اکثر احباب کا جذبۂ بے اختیارِ شوق اس تاکید پر غالب آجاتا ہے اور وہ مبارکباد کے کارڈ بھیجتے ہیں۔ مجھے ان کے خلوص اور محبت کا شدید احساس ہے جس کے لئے میں ان کا بیحد شکر گذار ہوں، لیکن یہ میرے لئے ممکن نہیں کہ میں انفرادی طور پر ان کا شکریہ ادا کروں، اگرچہ جی بہت چاہتا ہے کہ ایسا کرسکوں۔ میں بصد معذرت ان احباب سے درخواست کروں گا کہ وہ میرے اس اجتماعی ہدیۂ تشکر کو قبول فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ذوقِ قرآن میں مزید برکات عطا فرمائے جو اُن کے، میرے ساتھ اس قلبی تعلق کی بنیاد ہے۔

(۲) اسی طرح بہت سے احباب نے کنونشن کے بہ حسن و خوبی کامیاب ہونے کے لئے مجھے اپنی نیک آرزوؤں سے نوازا ہے۔ میں ان کا بھی بہ صمیم قلب شکر گذار ہوں۔ کنونشن کی کامیابی تنہا میری کامیابی نہیں، یہ جملہ قرآنی احباب کی کامیابی ہے۔　　والسلام　　رہینِ منت۔ پرویز

ختمِ نبوّت اور تحریکِ احمدیّت

جس کتاب کا اتنے عرصہ سے انتظار تھا، شائع ہوگئی۔ للہ الحمد

- مسئلہ قادیانیت کا قانونی فیصلہ تو ہوگیا ہے، لیکن ذہن ابھی تک اس کے متعلق صاف نہیں ہوئے۔
- ذہن صاف نہیں ہو سکتے جب تک یہ نکات واضح نہ ہوں کہ نبوت کا مقام کیا ہے۔ نبی کہتے کسے ہیں۔ ختمِ نبوت کا عملی مفہوم کیا ہے۔ تحریکِ "احمدیت" کے محرکات کیا تھے۔ یہ تحریک مذہبی نہیں بلکہ سیاسی تھی۔ مرزا غلام احمد کس طرح بتدریج اپنے آخری دعویٰ تک پہنچے۔ اس میں اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کے لئے کون کونسے خطرات پوشیدہ تھے۔ قادیانی (ربوی) اور لاہوری جماعتیں کس طرح ایک ہی سکّہ کے دو رُخ ہیں۔
- نبوّت کا دروازہ بند ہو جانے کے بعد، کون کون سی کھڑکیاں کھولی گئیں جن کے راستے اس قسم کے مدعیان، حصارِ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان کھڑکیوں کے بند کر دینے کا کیا طریق ہے۔
- اس کتاب میں ان تمام نکات پر قرآن مجید اور مرزائی لٹریچر کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔ اسلوب نہایت سنجیدہ، عالمانہ، محققانہ۔ اس موضوع پر اپنے انداز کی **اوّلین تصنیف**۔
- اعلیٰ درجہ کا ولایتی کاغذ۔ کور دیدہ زیب۔ تین سو سے زاید صفحات۔

قیمت فی جلد بارہ روپے

- فرمائش جلد بھیجیے۔ پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ (محصول ڈاک و پیکنگ۔ ایک روپیہ پچاس پیسے)

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵۔ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

تیری دُعا ہے کہ ہو آرزُو تیری پوری

میری دُعا ہے تیری آرزُو بدل جائے

۱ ملک میں پھیلی ہوئی عالمگیر مایوسی کا علاج۔

۲ "احمدیوں" کے متعلق فیصلہ کے اثرات۔

طلوعِ اسلام کنونشن منعقدہ اکتوبر ۱۹۷۴ء

میں

پرویز صاحب کا استقبالیہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

استقبالیہ

میری دعا ہے تیری آرزو بدل جائے

پیارے برادرانِ گلستانِ قرآنی۔ السلام علیکم و رحمۃ اللہ!

دنیا کی مختلف قومیں مختلف جشن مناتی ہیں۔ ہم بھی سال میں متعدد تقاریب کو جشنِ مسرت کہہ کر پکارتے ہیں، لیکن (جیسا کہ آپ کو معلوم ہے) ایک جشنِ مسرت ایسا ہے جسے خود خدا نے ہمارے لیے متعین کیا ہے اور وہ ہے جشنِ نزولِ قرآن، جسے عرفِ عام میں عید الفطر کہا جاتا ہے۔ یہ امر باعثِ ہزار برکات و سعادت ہے کہ ہمارا یہ اجتماع کہ جس کا بنیادی مقصد شمعِ قرآنی کی ضیا باریوں سے اپنے قلب و دماغ کی دنیا کو منور کرنا ہے۔ امسال، اس جشن سے پیوست منعقد ہو رہا ہے۔ بس یوں سمجھئے گویا عید کے بعد طرح میں اس تسلسلِ مسرت و انبساط پر آپ احباب کی خدمت میں ہزار گلہائے محبت و اخلاص کا تحفۂ بیش بہا پیش کرتا ہوں اور اسی کے ساتھ آپ کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ پچھلے دنوں آپ میں سے ایک دیرینہ رفیق نے کہ جن کا قلب عشقِ قرآن سے گداز ہے مجھ سے پوچھا کہ ہم کنونشن سے واپس جاتے ہیں تو سال بھر آپ کو یاد کرتے رہتے ہیں۔ کیا آپ بھی ہمیں یاد کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں! میں آپ کو کبھی یاد نہیں کرتا۔ مجھے یاد کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ اس جواب پر میں نے ان کے چہرے پر کچھ افسردگی کے آثار دیکھے تو کہا کہ میرے بھائی! ؎

وہ تمہیں یاد کرے جس نے بھلایا ہو کبھی
ہم نے تم کو نہ بھلایا نہ کبھی یاد کیا

آپ احباب تو میری چشمِ تصور سے کبھی اوجھل ہی نہیں ہوتے، اور حقیقت یہ ہے کہ یہی تصور میری تنہائیوں میں میرا مونس و غمخوار رہتا ہے اور آپ کی آمد کا انتظار میرے لئے تمنائے حیات۔ کس قدر حسین اور دلآویز ہے وہ انداز جس سے غالبؔ نے انتظار اور تمنا کے اس ربط کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

پھونکا ہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا
افسونِ انتظار، تمنا کہیں جسے

خدا آپ کو مسرتوں کے جھولے جھلائے اور ہر بلند مقصد میں کامیابی عطا فرمائے کہ اسی میں خود میری کامیابی کا راز ہے۔ آپ احباب کی رفاقت سے ؎

وقتِ مرا روانیٔ کوثر در آستیں
بزمِ مرا طراوتِ فردوس در کنار

امسال، میرے استقبالیہ کا موضوع ہے:

تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری　　مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

جو کچھ مَیں نے کہنا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ اسے اس سے پہلے سینکڑوں بار کہہ چکا ہوں اور جب تک کہنے کی سکت ہے اسے باربار کہے چلا جاؤں گا۔ قرآن مجید نے اپنے حقائق و معارف کی وضاحت کے لئے تصریفِ آیات کا انداز اختیار کیا ہے۔ یعنی انہیں باربار سامنے لانے کا انداز، کہ بسیط حقیقتوں کو دلوں میں راسخ اور ذہنوں میں پیوست کرنے کا اس سے زیادہ مؤثر انداز کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ مَیں نے بھی اپنے پیشِ نظر مقاصد و مدعا کی وضاحت کے لئے اتباعِ قرآنی میں یہی انداز اختیار کر رکھا ہے۔ مَیں آج کے خطاب میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ خارجی ماحول میں جو کچھ ظہور میں آتا ہے اس کا سرچشمہ انسانی آرزوئیں ہوتی ہیں۔ جس قسم کی آرزوئیں اُسی قسم کے خارجی احوال و کوائف۔ لہٰذا قوموں کے عروج و زوال کا مدار اور ان کی موت و حیات کا انحصار اس پر ہے کہ اس قوم کے افراد کے دلوں میں آرزو کس قسم کی بیدار ہوتی ہے۔ لیکن اس موضوع تک آنے سے پہلے ایک تمہیدی پس منظر ضروری ہے۔

مایوسی کا ماحول

سالِ گزشتہ مَیں نے کنونشن کے استقبالیہ میں کہا تھا کہ:

> جس قسم کے افسردہ و پژمردہ حالات میں ہم یہاں جمع ہو رہے ہیں ان کی مثال پاکستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ملک مختلف قسم کی ناکامیوں اور نامرادیوں سے اس سے پہلے بھی دوچار ہوا، لیکن قوم کے دل و دماغ پر جس قسم کی عالمگیر مایوسی کی گھٹائیں اس وقت چھا رہی ہیں، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔

اگر اب مَیں کہوں گا ——— اور انتہائی درد و کرب اور غم و اندوہ کے ساتھ کہوں گا کہ اس ایک سال کے عرصہ میں مایوسی اور ناامیدی کی ان گھٹاؤں میں اضافہ ہی ہوا ہے، کمی نہیں ہوئی، اور قوم کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی افسردگی اور پژمردگی، بہ حیثیت مجموعی بڑھی ہی ہے، گھٹی نہیں۔ حالات کی یہی شدید نامساعدت ہے جس کی وجہ سے مَیں نے ضروری سمجھا ہے کہ ان کے حقیقی اسباب کا تجزیہ کر کے دیکھا جائے کہ قرآن کریم ان کا علاج کیا بتاتا ہے کہ انسانی درماندگیوں اور ناکامیوں کا مداوا اس بارگاہ کے سوا کہیں سے نہیں مل سکتا۔

علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا تصور ۱۹۳۰ء میں دیا اور اس کے بعد ۱۹۳۸ء یعنی اپنی زندگی کے آخری لمحات تک اس خواب کی تعبیر کو اپنی فکر کا مرکز بنائے رکھا۔ انہوں نے اس متصورہ مملکت کی نظریاتی بنیادوں، اس کے نظام کے اصولی خط و خال اور اس کے استحکام و بقا کی شرائط اور مقتضیات کے سلسلہ میں بہت کچھ کہا۔ لیکن، اس کے ساتھ ہی ہمیں ان کے پیغام میں بہت کچھ ایسا بھی ملتا ہے جو ہمارے موجودہ حالات پر حرفاً حرفاً منطبق ہوتا ہے۔ انہوں نے شاعر کو "دیدۂ بینائے قوم" اور اپنے آپ کو "شاعرِ فردا" کہہ کر پکارا اور اپنی اسی دیدہ وری اور دوررس نگہی کی بنا پر کہا تھا کہ ؎

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے　　عکس اس کا میرے آئینۂ ادراک میں ہے

اقبالؒ کی دیدہ وری

جب ہم ان کے پیغام کے ان گوشوں پر نظر ڈالتے ہیں جن کا اطلاق ہمارے موجودہ حالات پر ہوتا ہے تو ان کا یہ دعویٰ حقیقت بن کر ہمارے سامنے آجاتا ہے اور یوں نظر آتا ہے جیسے وہ پچیس برس سے ہم میں بیٹھے ماجرائے قوم بیان کر رہے اور اس کی نکبت و زبوں حالی پر خون کے آنسو بہا رہے ہیں۔ انہوں نے حصولِ پاکستان کے لئے ہماری جد و جہد، پھر تشکیلِ پاکستان، اور اس کے بعد خود ہمارے اپنے ہاتھوں اس کی شکست و ریخت کو ایسے الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ ان کی جامعیت کو دیکھ کر نگہِ بصیرت وجد میں آجاتی ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ:

تراشیدم پرستیدم شکستم

میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی تاریخ لکھنے والے کے لئے ان تین عنوانات کے بعد کسی اور عنوان کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے گی۔ ہماری ساری داستان انہی کے اندر سمٹ آئے گی۔۔۔۔ تراشیدم، پرستیدم، شکستم۔

"شکستم" کی تفصیل کی طرف آیئے تو وہ کہتے ہیں:

کہیں سجادہ و عمامہ رہزن — کہیں ترسا بچوں کی چشم بیباک
ردائے دین و ملت پارہ پارہ — قبائے ملک و ملت چاک در چاک

وہ راہنماؤں کی اس رہزنی اور قافلہ سالاروں کی اس قزاقی کا نتیجہ یہ بتاتے ہیں کہ ؎

رو رہی ہے آج اک ٹوٹی ہوئی مینا اُسے — کل تلک گردش میں جس ساقی کے پیمانے رہے
آج ہیں خاموش وہ دشتِ جنوں پرور جہاں — رقص میں لیلیٰ رہی لیلیٰ کے دیوانے رہے

ہنود اور یہود جیسی رسوائے عالم اقوام کی سازشوں سے جس ذلت و خواری کی راکھ ہمارے سروں پر پڑی ہے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قیامت ہے کہ ؎

زمن امروز می خواہد سجودے — خداوندے کہ کردی اور اشکستم

اور اس کی وجہ وہ بتاتے ہیں، قوم کے جہاں بانوں کی، نورِ جہاں بینی سے محرومی۔ وہ بانگِ درا کی مشہور نظم طلوعِ اسلام میں کہتے ہیں کہ ؎

جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی — جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا

"جہاں بینی" کے لئے کون کونسی صلاحیتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے متعلق انہوں نے اس شرح و بسط سے لکھا ہے کہ اسے ضمنی طور پر کسی موضوع میں سمٹایا نہیں جا سکتا۔ لیکن انہوں نے بالِ جبریل کی ایک غزل کے چند اشعار میں جو اشارات دے دیئے ہیں ان سے نگاہِ فکر بہت کچھ اخذ کر سکتی ہے۔ غزل کا مقطع ہے ؎

نگاہِ فقر میں شانِ سکندری کیا ہے — خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے

اور اس کے بعد کے اشعار ہیں ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی — مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے
فلک نے ان کو عطا کی ہے خواجگی کہ جنہیں — خبر نہیں روشِ بندہ پروری کیا ہے
اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر! — کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

اور پھر یہ شعر کہ ؎

کسے نہیں ہے تمنائے سروری لیکن — خودی کی موت ہو جس میں وہ سروری کیا ہے؟

اس شعر کی تشریح انہوں نے مختلف مقامات پر کی ہے۔ اس لئے کہ خودی اور اس کی نگہبانی ان کے فلسفہ کا مرکز، ان کے پیغام کا محور اور ان کی تعلیم کا ماحصل ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے کہ جو قوم اپنی خودی، اپنی غیرت، حمیت، آبرو، خودداری، کو جھوٹے اقتدار کے حصول یا روٹی کے چند ٹکڑوں کے عوض بیچ ڈالے اسے ذلت و خواری سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ راہنمایانِ قوم کی اس قسم کی خود فروشی کو انتہائی فرومائیگی قرار دیتے ہیں اور جس قوم کی تقدیر اس قسم کے اربابِ اقتدار کے ہاتھ میں ہو وہ اس کی سوختہ بختی اور تیرہ کوکبی

پر خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص نشترانہ انداز میں کہتے ہیں ؎

اِک مفلسِ خوددار یہ کہتا تھا خدا سے — میں کر نہیں سکتا گلۂ دردِ فقیری

لیکن یہ بتا تیری اجازت سے فرشتے — کرتے ہیں عطا مردِ فرومایہ کو میری!

وہ کہتے ہیں کہ جن اربابِ اقتدار کی خودی مستحکم ہوتی ہے احترامِ آدمیت ان کی جہاں بانی کا موقف ہوتا ہے جس سے افرادِ معاشرہ ان کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے خود انسانیت بڑھتی، پھولتی، پھلتی ہے۔ لیکن جن کی خودی مستحکم نہیں ہوتی وہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں اور اپنے اس نفسیاتی خلا کو پُر کرنے کے لیے وہ معاشرہ سے انتقام لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک جہاں بانی کا ایک ہی طریق ہوتا ہے، یعنی قوت کا استعمال۔ اس سے ان کے ہوسِ اقتدار کی تو تسکین ہو جاتی ہے لیکن مملکت تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ ایسے ہی حکمرانوں سے کہتے ہیں کہ ؎

یہ جبر و قہر نہیں ہے، یہ عشق و مستی ہے — کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی

یہ تو ہی بساطِ اقتدار کی بات۔ جہاں تک نظامِ مملکت کا تعلق ہے ہمارا دَورِ انقلابات پر بے حد نازاں ہے۔ ایک ملوکیت یا آمریت کے بجائے جمہوریت اور دوسرا سوشلزم کا نظام سیاست جس میں باور یہ کرایا جاتا ہے کہ زمامِ اقتدار محنت کشوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ جہاں تک مغربی نظامِ جمہوریت کا تعلق ہے اقبالؔ نے بہت عرصہ پہلے کہہ دیا تھا کہ ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام — جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

جس نظام میں انسانوں پر انسانوں کی حکومت ہو اس میں شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں آمریت کا استبداد اسی طرح باقی رہتا ہے، فرق صرف اصطلاحات کا ہوتا ہے۔ جہاں تک سوشلزم کے پولیٹیکل سسٹم کا تعلق ہے، اس دیدہ ور کی نگاہوں نے بہت پہلے بھانپ لیا تھا کہ ؎

زمامِ کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا — طریقِ کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

یہ تو ہیں غلط نظامِ سیاست کی تباہ کاریاں۔ جہاں تک اربابِ مذہب کا تعلق ہے، جو کچھ یہ لوگ خدا کے نام کی آڑ لے کر کرتے ہیں۔ اقبالؔ نے اس کا ماحصل اس جامعیت اور برجستگی سے ایک مصرعہ میں سمو کر رکھ دیا ہے کہ اس پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یعنی

دینِ کافر، فکر و تدبیرِ جہاد — دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد

مملکتِ پاکستان پچیس سال سے اسی "فساد فی سبیل اللہ" کی آماجگاہ بنی رہی ہے۔

یاس انگیز شاعری

آپ غور کیجئے عزیزانِ من! کہ جس معاشرہ کی برسوں سے یہ حالت چلی آ رہی ہو، اس میں مایوسی اور بددلی، افسردگی اور پژمردگی نہیں پھیلے گی تو اور کیا ہوگا! شاعری کو معاشرہ کا آئینہ (MIRROR OF THE SOCIETY) کہا جاتا ہے۔ ——— اور آئینہ سے زیادہ سچا کون ہو سکتا ہے۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ہاں یہ آئینہ دھندلا چکا ہے اور یا محدب بن چکا ہے جس میں کوئی چہرہ اپنی اصلی شکل میں دکھائی نہیں دیتا۔ بایں ہمہ، جہاں تک معاشرہ پر چھائی ہوئی عالمگیر مایوسی کا تعلق ہے اس کی عکاسی ہماری شاعری کر رہی ہے۔ شاعر کو اتنا (ADVANTAGE) ضرور ہوتا ہے کہ وہ اشارات، کنایات، تشبیہات اور استعارات کے پردوں میں دل کی بات کہہ جاتا ہے۔ وہ ہمارے موجودہ معاشرہ کی شکیب آزما گھٹن اور مصلحت کوشانہ منافقت کے متعلق کہتا ہے کہ ؎

چھپ چھپ کے روؤں اور سرِ انجمن ہنسوں
مجھ کو یہ مشورہ مرے درد آشنا کا ہے

بہت سے تو اس نصیحت پر عمل پیرا ہو جاتے ہیں، لیکن بعض ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ؎

دل میں اٹھا ہے درد تو اظہارِ درد کر
آنسو اُمنڈ پڑے ہیں تو منہ موڑ کے نہ جا

جن کے آنسو اُمنڈ پڑتے ہیں وہ زیادہ کچھ تو نہیں کہہ سکتے، اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ؎

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

جس مملکت کا خواب، اقبالؒ کی چشمِ بیدار نے دیکھا اور جس کا تصور قائدِاعظم کی نگہِ بلند نے دیا تھا حصولِ پاکستان کے بعد بھی وہ اس مملکت کا بدستور منتظر ہے اور بصد حسرت و یاس کہتا ہے کہ ؎

نہ ہے لبوں پہ تبسم، نہ ہے نظر میں پیام
وہ آ گئے ہیں مگر انتظار باقی ہے

لیکن انتظار کی یہ صبر آزما گھڑیاں، ہجر کی تیرہ و تار راتوں کی طرح اس قدر طویل ہیں کہ وہ تھک کر نڈھال ہو جاتا ہے اور انتہائی بے بسی کے عالم میں پوچھتا ہے کہ ؎

گم ہوئی ہے کہاں کلیدِ سحر!
گردشِ روزگار، کچھ تو کہو

گم شدہ راستوں کے ویرانو
داستانِ غبار، کچھ تو کہو

کیا، کہیں غم کی انتہا بھی ہے؟
غم کے پروردگار، کچھ تو کہو

افرادِ معاشرہ کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں ملتا، تو وہ بصد یاس و حرماں آسمان کی طرف تکتا ہے اور ٹھنڈی آہ بھر کر کہتا ہے کہ ؎

تنہائی کے نازک لمحوں میں، کچھ تم ہی ستارو بات کرو
تم نے تو وہ شب دیکھی ہو گی جس شب کی سحر ہو جاتی ہے

جب اس کے غم گسار اور درد آشنا اس سے کہتے ہیں کہ شبِ تنہائی میں تم پر کیا گذری، اس کا کچھ ماجرا ہمیں بھی سناؤ تو وہ ان سے کہتا ہے کہ کچھ ماجرا کہوں؛ میں تو اس کی ساری کیفیات سنانے کے لئے تیار ہوں، لیکن کیا کروں ؎

کس قیامت سے شبِ ہجر میری گذری ہے
کہیں میری شبِ ہجراں کی سحر ہو تو کہوں

اور جو اس داستان کے سنانے پر آمادہ ہو جاتے ہیں، وہ بھی یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں کہ ؎

ہم اپنی روداد کیا سنائیں، کہ اس میں ہیں واقعات ایسے
اگر کوئی دوسرا سناتا، ہمیں سمجھتے اسے فسانہ!

میں تو اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ حالت ہماری یہ ہو چکی ہے کہ جس سے ملو، اس کی:

زبان کچھ اور، بوئے پیرہن کچھ اور کہتی ہے جی[1]

یہ ہے عزیزانِ من! ہمارے معاشرہ کی وہ تصویر جو شاعر کا آئینہ ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ جن کی قوتِ برداشت جواب دے چکی ہے وہ اس تصویر کو دیکھ کر چیخ اٹھتے اور کہتے ہیں کہ ؎

---

[1] بوئے پیرہن سے مجھے ایک اور شعر یاد آ گیا جو اسی کی تشریح کرتا ہے ؎

بزم میں دیکھا ہے کس حسرت سے میں نے سوئے دوست
مجھ کو دشمن سے گلے مل کر جو آئی بوئے دوست

چڑیاں ترسیں گھونٹ کو، دھرتی دُھواں اڑائے
تم رہو ایسے دیس میں ہم سے رہا نہ جائے

یہ فرار کی راہ ہے

لیکن میرے ہم سفرو! میرے عزیز رفیقو! یہ تو اعترافِ شکست ہے۔ یہ فرار کی راہ ہے بشمعِ قرآنی کی روشنی میں راستے طے کرنے والے تو اس روش کو اختیار نہیں کر سکتے۔ حق و باطل کی کش مکش میں فرار تو ایک طرف غیر جانبداری (INDIFFERENCE) بھی درحقیقت باطل کی تائید ہوتی ہے۔ زندگی متحرک واقع ہوئی ہے۔ جمود موت کا نام ہے —— جاوداں، پیہم رواں، ہر دم جواں ہے زندگی —— ایک مقام پر کھڑا ہو جانے والا اگر سمجھتا ہے کہ وہ اگر آگے نہیں بڑھ رہا تو پیچھے بھی نہیں ہٹ رہا تو وہ اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ ایک مقام پر کھڑا ہو جانے والا درحقیقت پیچھے ہٹ رہا ہوتا ہے، کیونکہ اس دوران میں کاروانِ حیات کتنا ہی آگے جا چکا ہوتا ہے۔ کیسے خوبصورت انداز میں کہنے والا اس بات کو کہہ گیا ہے کہ ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

مقاصدِ زندگی کی طرف سے بے اعتنا (INDIFFERENT) ہو کر ایک طرف ہو جانا مایوسی کی انتہا ہے۔ اسے قرآن قنوط سے تعبیر کرتا ہے اور قنوط کے معنی ہی رُک جانے یا روک بن جانے کے ہیں۔ انسان قنوط کا شکار اس وقت ہوتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ جس مصیبت میں وہ گرفتار ہے اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں رہا۔ اور قرآن کہتا ہے کہ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (۳۹/۵۳) خدا کی رحمت سے کبھی ناامید نہ ہو۔ یہاں رحمت کا لفظ ایک عظیم حقیقت کی طرف راہنمائی کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کئی ایک مقامات پر قرآن مجید کو رحمت کہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھنے والا کبھی مایوس نہیں ہو سکتا۔ میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ مایوس وہ ہوتا ہے جس کے سامنے کشادگی کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی، سب دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن ارشادِ خداوندی ہے کہ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ...... (۲۹/۶۹) جو لوگ سفرِ حیات میں تھک کر یا منہ موڑ کر نہیں بیٹھ جاتے۔ اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں تو ان کے سامنے اگر ایک راستہ بند ہو جاتا ہے تو ہم کئی، اور راستوں کی طرف ان کی راہ نمائی کر دیتے ہیں۔ لہٰذا جس کے سامنے اتنے راستے کشادہ ہوں وہ مایوس کس طرح ہو سکتا ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیٔ داماں بھی ہے

آیئے ہم دیکھیں کہ قرآن کریم موجودہ یاس انگیز ماحول سے نکلنے کی راہ کیا بتاتا ہے جس میں بعض لوگ غیر جانبداری یا بے اعتنائی کے فریبِ نفس میں مبتلا ہو کر، جہادِ زندگانی سے منہ موڑ چکے ہیں اور جن کے خون میں حرارت ہے، انہوں نے سرکشی اور فساد انگیزی کی تخریبی روش اختیار کر لی ہے۔

قرآن کی ایک آیت

جو اربابِ دانش، اصلاحِ معاشرہ کے لئے اپنے ذہن سے تدابیر سوچتے ہیں وہ مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ ملک میں رائج قوانین میں بنیادی خرابی ہے جس کی وجہ سے حالات میں اصلاح نہیں ہوتی۔ کوئی کہتا ہے کہ یہاں کا سیاسی نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے۔ جس کی وجہ سے مملکت کی عمارت مخدوش چلی آ رہی ہے۔ ایک طرف سے آواز آتی ہے کہ اصل خرابی معاشی نظام کی ہے۔ روٹی کا مسئلہ حل ہو جائے تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ یہ اور اسی قسم کی اور آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہیں۔ لیکن قرآن کچھ اور کہتا ہے اور جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے متعلق میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اگر میں قرآن سے شناسا نہ ہوتا اور کوئی شخص اس کی صرف یہ ایک آیت میرے سامنے لاتا اور کہتا کہ یہ بات چودہ سو سال پہلے کہی گئی تھی تو تاریخ، سیاست اور نفسیات کا طالب علم ہونے کی جہت سے میں اگر اس پر غور کرتا تو بلا توقف پکار اٹھتا کہ یہ انسانی فکر کی تخلیق نہیں ہو سکتی۔ اس کا سرچشمہ یقیناً فکرِ انسانی سے ماوراء ہے۔ وہ آیۂ جلیلہ یہ ہے جسے پڑھا تو اکثر جاتا ہے لیکن جس پر غور بہت کم کیا جاتا ہے۔ وہ ہے سورۃ الرعد کی گیارھویں آیت جس میں

کہا گیا ہے کہ:

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ...... (۱۳/۱۱)

یاد رکھو! کسی قوم کے خارجی حالات میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ قطعاً نہیں ہو سکتی۔ وہ قوم جو جی میں آئے کر دیکھے اس کے احوال و ظروف کبھی نہیں بدل سکتے، جب تک وہ قوم اپنے اندر تبدیلی نہ پیدا کرے۔ جب تک اس کے قلب و دماغ میں تبدیلی نہ ہو۔ جب تک اس کی ذہنیت نہ بدلے۔ جب تک اس میں فکری اور ذہنی تبدیلی نہ ہو۔ جب تک اس میں نفسیاتی تبدیلی نہ ہو۔ یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔

جو کچھ قرآن نے کہا ہے، باقی دنیا کے لئے اس کی حیثیت ایک اصول کی سی ہے۔ ایک نظریہ کی ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ اگر تمہیں اس کی صداقت پر یقین نہ ہو تو تم اس کے بجائے کوئی اور طریق اختیار کر کے اسے آزما کر دیکھ لو۔ وہ قطعاً کامیاب ثابت نہیں ہوگا۔ وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ۔ جو اصول تمہارے سامنے پیش کیا جا رہا ہے اگر تمہیں اس کی صداقت میں شک ہے تو تم اس کی مثل کوئی اور اصول اور نظام اور طریق کار اور ضابطہ وضع کر کے دیکھ لو۔ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُم مِّن دُونِ اللَّهِ .... (۲/۲۳) تم اکیلے ہی نہیں اپنے ساتھ دنیا بھر کے ارباب فکر و دانش کو ملا لو اور سب مل کر اس کی کوشش کر دیکھو، تم کبھی کامیاب نہ ہو سکو گے۔

یہ تو غیر مسلموں کے لئے ہے۔ لیکن مسلمان جو قرآن کی صداقت پر ایمان رکھنے کے مدعی ہیں ان کے لیے اس اصول کی حیثیت مختلف ہے۔ اگر وہ سمجھیں کہ تغیر احوال کی صورت یہ نہیں، کوئی اور ہے تو یہ کفر ہوگا اگر وہ سمجھیں کہ یہ بھی ایک تدبیر ہو سکتی ہے لیکن اس کے علاوہ اور بھی تدابیر ہیں تو یہ شرک ہوگا، اور اگر وہ اس تدبیر خداوندی کو چھوڑ کر دیگر تدابیر پر عمل پیرا ہو جائیں تو یہ گویا خدا کو چیلنج دینا ہوگا کہ تم کہتے ہو کہ تغیر احوال کی ایک ہی صورت ہے، یعنی تغیرِ نفس۔ لیکن ہم تغیرِ نفس کے بغیر اپنے حالات میں تبدیلی کر کے بتا دیں گے۔ (معاذ اللہ ثم معاذ اللہ)۔

غیر مسلم عقل کے تجرباتی طریق سے مختلف تدابیر کے آزمانے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچ رہے ہیں کہ نظریاتی تبدیلی کے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ لینن کا نظریہ تھا کہ:

> تشدد کے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ یہ ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط، قوت و استبداد، نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکے سے زبردستی کراتا ہے۔ (STATE AND REVOLUTION)

لیکن اُسی کمیونزم کا حامی، چین کا عظیم لیڈر ماؤزے تنگ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ یہ غلط ہے۔ نظریاتی تبدیلی کے بغیر انقلاب نہیں لایا جا سکتا، اور نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑا طویل المیعاد پروگرام درکار ہوتا ہے۔ چین کے مشہور مجلہ "پیکنگ ریویو" کی ۲۰ مارچ ۱۹۷۰ء کی اشاعت میں اس کا (ماؤزے تنگ کا) ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا تھا۔

> دانشوروں کا مسئلہ آئیڈیالوجی کا ہے اور آئیڈیالوجی سے متعلق مسائل کو حل کرنے کے لئے جبر و استبداد کے بھونڈے طریقے نہ صرف یہ کہ مفید نہیں ہوتے بلکہ نقصان رساں ہوتے ہیں۔ ہمارے رفقاء کو معلوم ہونا چاہئے کہ نظریاتی تبدیلی کے لئے بڑے بڑے طویل المیعاد، صبر آزما اور استقامت طلب پروگرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں یہ نہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ محض چند لیکچروں اور جلسوں سے لوگوں کے نظریات میں تبدیلی پیدا کرا لیں گے۔ قوموں کے نظریات صدیوں میں جا کر مرتب ہوتے ہیں اس لئے انہیں راتوں رات بدلا نہیں جا سکتا۔

یہ کام جبر و استبداد سے نہیں ہوگا۔ لوگوں کے قلب و دماغ کو رفتہ رفتہ اس تبدیلی کے لئے آمادہ کرنا ہوگا۔

غیر مسلم تو مختلف تدابیر آزما لینے کے بعد اس اصول کو صحیح ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں جسے قرآن نے پیش کیا تھا اور ہم یہاں چھبیس سال سے خدا کے خلاف محاذ قائم کئے ہوئے ہیں کہ ہم نفسیاتی تبدیلی کے بغیر انقلاب لاکر بتا دیں گے۔ لہٰذا جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے وہ اسی کا نتیجہ ہے اور جب تک ہم اپنی موجودہ روش کو تبدیل کرکے، قرآن کے تجویز کردہ اصول کی طرف نہیں آتے ہمارے حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پاکستان میں یہ سعادت صرف طلوعِ اسلام کے حصّے میں آئی کہ اس نے قرآن کریم کے اس ابدی، غیر متبدل اصول کی طرف دعوت دی ——— اور وہ اس دعوت کو مسلسل و متواتر پیش کئے چلا آ رہا ہے۔ قوم نے بہ حیثیت مجموعی اس سے جو بے اعتنائی برتی اسے تو چھوڑیئے۔ میں نے جب اچھے اچھے دانشوروں کے سامنے اس اصول کو پیش کیا تو ان کی طرف سے جواب یہ ملتا رہا کہ ہاں! بات تو تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن یہ بڑا لمبا پروگرام ہے۔ کوئی (SHORT - CUT) بتایئے، اور جب میں کہتا کہ مجھے تو قرآن سے کوئی شارٹ کٹ (چھوٹا راستہ) نہیں ملتا تو وہ یہ کہہ کر چل دیتے کہ ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک   کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

میں ان حضرات سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا آپ کو کوئی "شارٹ کٹ" مل گیا جس پر چل کر آپ نے قوم کو تباہی سے بچا لیا؟ اور ساتھ ہی یہ کہ کیا آپ نے خدا کو چیلنج کرنے کا نتیجہ دیکھ لیا؟

میں، اس مقام پر دلی مبارک باد دیتا ہوں آپ احباب کو کہ آپ جو قرآن کے اس اصول کی صداقت پر ایمان لائے تو پھر نہ مسافت کا طول آپ میں کسی قسم کی درماندگی پیدا کر سکا اور نہ ہی راستے کے کانٹے آپ کے پاؤں لغزش پیدا کر سکے۔ آپ دل کے کامل سکون اور ثبات کے ساتھ اس راستے پر چلتے رہے اور اس طرف کبھی خیال بھی نہ آیا کہ اس کے سوا کوئی اور راستہ بھی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کے اس یقین میں مزید استحکام اور ہمتوں میں مزید برکت عطا فرمائے۔

تغیرِ نفس

سوال یہ ہے کہ جسے تغیرِ نفس کہا جاتا ہے اس کا مفہوم کیا ہے؟ میں اگر اس سوال کے متعلق نظری گفتگو کروں تو مجھے سب سے پہلے علم النفس کی گہرائیوں اور پہنائیوں میں جانا پڑے گا۔ اس کے لئے نہ فرصت ہے اور نہ ہی میں سمجھتا ہوں اس کی ضرورت۔ لہٰذا اس وقت میں اس کے عملی مفہوم تک محدود رہنا چاہتا ہوں اور وہ ایک مثال سے بآسانی سمجھ میں آ سکتا ہے۔ آپ کے دل میں کنونشن میں شرکت کی آرزو پیدا ہوئی۔ اس کے لئے آپ نے لاہور آنے کا ارادہ کیا، اور اس ارادہ کو عمل میں لانے کے لئے گھر سے روانہ بھی ہو گئے۔ لیکن آپ آدھے راستے سے پلٹ گئے۔ کسی نے آپ سے پوچھا کہ آپ پلٹ کیوں آئے؟ اس کے جواب میں آپ یہی کہیں گے کہ میں نے اپنا ارادہ بدل لیا ہے۔ اس کا نام ہے تغیرِ نفس۔ پہلے کنونشن میں شرکت آپ کا مقصد تھا۔ اس کے بعد وہ مقصد بدل گیا اور اس مقصد کی تبدیلی کے ساتھ ہی آپ نے اپنا سارا پروگرام بدل لیا ——— واضح رہے کہ ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ آپ کسی مجبوری کی وجہ سے کنونشن میں شریک نہ ہو سکے ہوں۔ اسے مقصد کی تبدیلی نہیں کہیں گے۔ اس کے لئے کہیں گے کہ آپ کے مقصد کے حصول کی راہ میں ناقابلِ عبور رکاوٹ حائل ہو گئی۔ مقصد کی تبدیلی اس وقت کہیں گے جب آپ کنونشن میں شرکت کا ارادہ بدل لیں۔ اسے تغیرِ نفس کہا جائے گا۔

قرآن کریم انسانی زندگی کا ایک مقصد متعین کرتا ہے۔ اس مقصد کی صداقت پر یقین، ایمان کہلاتا ہے۔ بالفاظِ دیگر آپ اس مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لیتے ہیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے جس تگ و دو کی جائے قرآن اسے "اعمالِ صالحہ" کہہ کر پکارتا ہے

قرآن کی ساری تعلیم انہی دو اصطلاحات میں سمٹ کر آجاتی ہے۔ یعنی آمنوا وعملوا الصالحات۔ قرآنی مقصد کو اپنی زندگی کا مقصد قرار دینا اور پھر اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرنا۔ اقبالؔ نے قرآن کی اس اساسی تعلیم کو اپنے پیغام کا محور قرار دیا جس کے گرد اس کا سارا کلام گردش کرتا ہے۔ وہ اسے کبھی مقصد کہتا ہے، کبھی آرزو۔ کبھی عزم کہہ کر پکارتا ہے، کبھی ایمان یا یقین —— حصولِ مقصد کی آرزو میں جب شدت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اسے عشق سے تعبیر کرتا ہے اور اس راستہ میں جس قدر تگ و دو کی جائے اسے جہادِ زندگی۔ اس کی اصطلاحات کے اس مفہوم کو سامنے رکھ کر اگر آپ پیامِ اقبالؔ کا مطالعہ کریں گے تو نہ صرف اس کا صحیح مفہوم آپ کی سمجھ میں آجائے گا بلکہ قرآنی فکر کی وہ شمعیں بھی فروزاں تر ہوتی جائیں گی جنہیں وہ اپنے خونِ جگر سے روشن کئے چلا آرہا ہوں۔

مقصد اور آرزو

اقبالؔ کہتا ہے کہ ؎

زندگانی را بقا از آرزوست کاروانش را درا، از آرزوست
زندگی در جستجو پوشیدہ است اصلِ اُو در آرزو پوشیدہ است

دوسری جگہ ہے ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم!

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے، جو شخص کشمکشِ حیات سے فرار کی راہ اختیار کر کے، غیر جانبداری کا نقاب اوڑھ لیتا ہے اس کے دل میں شمعِ آرزو بجھ جاتی ہے۔ اس سے وہ زندہ انسانوں کی صف میں شمار ہونے کے قابل نہیں رہتا۔ جامد پتھر ہو جاتا ہے۔ اقبالؔ کے الفاظ میں ؎

ہر کہ تخمِ آرزو در دل نہ کشت پائمالِ دیگراں مثلِ سنگ و خشت
آب و گِل را آرزو آدم کند آرزو ما را ز خود محرم کند!

اقبالؔ کے نزدیک، تعینِ مقصد کے بعد اس کے حصول کے لئے آرزو کا نام خودی ہے۔ اس کا فلسفۂ خودی، قرآن کے نکتۂ ایمان ہی کی تفسیر ہے۔

قرآن کی رُو سے مقصد

سوال یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کا مقصدِ حیات کیا بتایا ہے جسے ان کا ایمان کہا جائے گا۔ تفصیل میں جائیے تو اس کے لئے پورے قرآن کی تفسیر درکار ہو گی۔ لیکن اجمال کی طرف آئیے تو اس کی ایک آیت اس مقصد کو سامنے لے آئے گی اور وہ آیۂ جلیلہ یہ ہے کہ:

هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ (۹/۳۳)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور نظامِ زندگی دے کر بھیجا جو سراسر حق پر مبنی ہے۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ یہ نظام، انسانوں کے خود ساختہ تمام نظامات پر غالب آکر رہے گا۔ خواہ یہ بات مشرکین کو کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلام ایک عظیم انقلابی پروگرام کا نام ہے جس کا مقصد خدا کے متعین کردہ نظام کو تمام نظامہائے عالم پر غالب کرنا ہے۔ جو شخص اس نصب العین کو اپنی زندگی کا مقصد و منتہیٰ قرار دے لیتا ہے اسے مسلم یا مومن کہا جاتا ہے اور ایسے افراد پر مشتمل گروہ کو امتِ مسلمہ یا

جماعتِ مومنین، جنہیں خدا "یا ایھا الذین آمنوا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد کو اپنی زندگی کا منتہیٰ قرار دینے کے لئے سب سے پہلے فکری اور قلبی تبدیلی کی ضرورت ہو گی۔ کیونکہ جب تک آپ دیگر تمام مقاصد سے منہ نہیں موڑیں گے اسے اپنی زندگی کا واحد نصب العین قرار نہیں دے سکیں گے۔ اسی کو قرآن نفسیاتی تغیر سے تعبیر کرتا ہے۔ اس تبدیلی سے انسان کی زندگی کا مقصد بدل جاتا ہے۔ منزل بدل جاتی ہے۔ آرزو بدل جاتی ہے، اور جب مقصد، منزل اور آرزو بدل جائے تو (اسی مثال کی رو سے جسے میں نے پہلے پیش کیا ہے) سفرِ حیات کی راہیں بدل جاتی ہیں۔ اس کے رفقائے سفر بدل جاتے ہیں۔ اسی کا نام ماحول کی تبدیلی ہے جسے قرآن "مَا بِقَوْمٍ" کہہ کر پکارتا ہے۔ یوں قرآن کے عطا کردہ اصول کے مطابق انسان کی داخلی تبدیلی سے اس کے خارجی احوال وکوائف بدل جاتے ہیں، قرآن انسان کے اندر اسی قسم کی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود　　　جاں چوں دیگر شد، جہاں دیگر شود

"جاں دیگر شود" کے نتیجہ میں "جہاں دیگر شود" کے معنی یہ ہیں کہ پھر اشیائے کائنات کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ ان کی اہمیتوں کے پیمانے بدل جاتے ہیں۔ جب آپ کا ارادہ کنونشن میں شرکت کا تھا تو آپ لاہور کی طرف آنے والی بس کے پیچھے لپک کر جاتے تھے اور خود اپنے گھر کی طرف جانے والی بس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ لیکن جب آپ نے اپنا ارادہ بدل لیا تو آپ کی نگاہوں میں بسوں کی قدر و قیمت الٹ گئی۔ اب لاہور کی طرف آنے والی بس میں کوئی جاذبیت نہ رہی اور گھر کی طرف جانے والی بس آپ کی آنکھ کا تارا بن گئی۔ مقصد کے بدل جانے سے خارجی اشیاء کی قدر و قیمت یوں بدل جاتی ہے۔ اشیائے کائنات بلکہ انسانی رشتوں تک کی بھی تقابلی قدر و قیمت اور اضافی کشش و جاذبیت ہے جس کی تشریح کرتے ہوئے قرآن کریم نے کہا ہے کہ:

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ۔ (۹/۲۴)

اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے ماں باپ یا اولاد۔ تمہارے بھائی بند یا ازواج۔ تمہارے اعزہ اقارب یا مال و دولت۔ تمہارا کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم ڈرتے ہو۔ تمہارے محلات جنہیں تم اس قدر محبوب رکھتے ہو۔ (غرضیکہ دنیا کی جاذب سے جاذب تر اشیاء) میں سے کوئی چیز بھی اس نظامِ خداوندی کی راہ میں جسے اس کا رسول قائم کر رہا ہے جد و جہد سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ تو پھر تم اپنے مقدر و مستقبل کے متعلق خدا کے فیصلے کا انتظار کرو۔ وہ اس قوم پر کشاد کی راہ نہیں کھولا کرتا، جو غلط راہوں کی طرف نکل جائے۔

یہ ہے نگاہ کی تبدیلی جو قرآن کے مقررہ کردہ نصب العین کو حیات قرار دینے سے واقع ہو جاتی ہے اور جس سے خارجی اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ ان کی جاذبیتیں بدل جاتی ہیں۔ اس وقت ہر عبدِ مومن کی زبان پر یہ ہوتا ہے کہ ؎

عشق میں ایک تم ہمارے ہو　　　باقی جو کچھ ہے سب تمہارا ہے

قرآن کریم نے اپنے مقرر کردہ نصب العین کی طرف جانے والے پروگرام کو نظامِ صلوٰۃ سے تعبیر کیا ہے۔ اس پروگرام میں ان اجتماعات کو جنہیں اب نماز کہہ کر پکارا جاتا ہے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جب آپ اس کی نیت کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ

لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّ مَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۶/۸۰) "میں نے دنیا کی تمام جاذبیتوں اور مقاصد سے منہ موڑ کر، خدا کے مقرر کردہ مقصد کو اپنا نصب العین حیات قرار دے رکھا ہے۔ میرا رخ سیدھا اسی منزل کی طرف ہے۔ وہی میرا قبلۂ مقصود اور کعبۂ مراد ہے۔ میں اس کے ساتھ کسی اور مقصد، کشش یا جاذبیت کو شریک نہیں کرتا" اس نیت کے بعد آپ اس مقصد کے حصول کی آرزو کا بار بار اعادہ کرتے ہیں ـــ یہ نفسیات کا اصول ہے کہ جس آرزو کا بار بار اعادہ کیا جائے اس میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طریق سے آرزو میں پختگی پیدا کرنے کا نام دعا ہے۔ دیکھئے! اقبالؒ نے اس حقیقت کو اپنی اس نظم میں کس حسن و خوبی سے پیش کیا ہے جس کا ایک مصرعہ میرے اس استقبالیہ کا عنوان ہے۔ نظم ہے۔

تری دعا سے قضا تو بدل نہیں سکتی — مگر ہے اس سے یہ ممکن کہ تو بدل جائے
تری خودی میں اگر انقلاب ہو پیدا — عجب نہیں ہے کہ یہ چار سو بدل جائے
وہی شراب وہی ہائے ہو رہے باقی — طریقِ ساقی و رسمِ کدہ بدل جائے
تری دعا ہے کہ ہو آرزو تری پوری — میری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے سامنے یہی مقصدِ حیات تھا۔ یعنی دین الحق، نظامِ خداوندی کو تمام دنیائے عالم پر غالب کرنا۔ انہوں نے اپنے یقینِ محکم اور عملِ پیہم سے چند سالوں کے عرصہ میں ایسا کر کے دکھا دیا۔ اس زمانے میں ایران اور روما الکبریٰ کے نظام ہی دنیا میں سربلند اور غالب نظام تھے۔ قرآنی نظام نے ان دونوں نظاموں کو شکست دے کر اپنے نظام کو غالب کر کے دکھا دیا۔ یاد رکھئے صدرِ اوّل کی فتوحات، علاقوں اور ملکوں کی فتوحات نہیں تھیں۔ وہ انسانوں کے وضع کردہ نظاموں پر نظامِ خداوندی کی فتح تھی۔ وہ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ کا عملی مظاہرہ تھا۔

دین کا مذہب میں بدل جانا

لیکن تاریخ کا یہ عجیب المیہ ہے کہ ایک انقلابی نظام جن عناصر کو شکست دیتا ہے کچھ عرصہ کے بعد جب اس انقلاب آفریں جماعت کے اخلاف کے مقاصدِ حیات بدل جاتے ہیں اور اس طرح ان کی انقلابی قوتوں میں ضعف آنے لگتا ہے تو وہ شکست خوردہ عناصر اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لئے پھر سے ابھر آتے ہیں۔ لیکن وہ ٹیکنیک عجیب اختیار کرتے ہیں۔ وہ اپنے قدیم نظریات اور رسومات کا احیاء نہیں کرتے۔ کیونکہ اس جماعت کے وارثوں کو ان الفاظ و ارکان سے چڑ ہوتی ہے۔ وہ ان کے نظریات کے لفظوں اور ان کے ارکان کی شکلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رہنے دیتے ہیں، صرف ان کا مقصدِ حیات بدل دیتے ہیں۔ امتِ مسلمہ کا مقصدِ حیات دنیا میں نظامِ خداوندی کا غالب کرنا تھا۔ وہ اس مقصد کو ان کی نگاہوں سے اوجھل کر کے، انفرادی نجات کو مقصودِ زندگی قرار دے دیتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں دین کو مذہب سے بدل دینا۔ نزولِ قرآن سے پہلے جتنے مذاہب تھے ان کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ وہ اپنے آغاز میں دین تھے، شکست خوردہ قوتوں نے انہیں بعد میں مذہب میں تبدیل کر دیا۔ یہی کچھ اسلام کے ساتھ ہوا۔ اس نے نظامِ خداوندی کے قیام سے ملوکیت، مذہبی پیشوائیت اور نظامِ سرمایہ داری کو شکست دی تھی، جب مسلمانوں کا مقصدِ حیات بدل گیا تو یہ قوتیں ابھر آئیں۔ انہوں نے قرآن کے حروف، معتقدات کے الفاظ، نظامِ خداوندی کے پروگرام کے ارکان صوم و صلوٰۃ وغیرہ کی شکلوں کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا لیکن ان کے مفہوم کو بدل دیا۔ مقصود کو بدل دیا، اور اس کے بعد عوام کے دل میں اس عقیدہ کو راسخ سے راسخ تر کرتے چلے گئے کہ یہی اسلام ہے اور اسی کا قائم رکھنا مسلمانوں کا مذہبی فریضہ جس سے

خوشنودیٔ باری تعالیٰ حاصل ہوتی ہے۔ اب ان کے "علماء کرام" کا فریضہ نظامِ خداوندی کو دیگر نظامات پر غالب کرنا نہ رہا بلکہ دیگر مذاہب کے مقابلہ میں مذہب اسلام کی افضلیت ثابت کرنا رہ گیا ــــ اتنا ہی نہیں بلکہ خود ان کے اپنے اندر، مختلف فرقوں کے نزدیک اسلام کی خدمت یہ قرار دیا گیا کہ دوسرے فرقوں کے مسالک کے مقابلہ میں اپنے فرقے کے مسلک کی برتری ثابت کر دیں۔ اب ان کے نزدیک بحث طلب مسائل اس قسم کے رہ گئے کہ نماز میں آمین خفی آواز سے کہنی چاہیے یا بلند آواز سے۔ یا پھر اس قسم کے نظری مباحث کہ ؎

ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے　　　ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات

آنے والے سے مسیح ناصری مقصود ہے　　　یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات

تجدیدِ مقصود

سابقہ اقوام جب اس سطح پر اتر آتی تھیں تو ان کی طرف خدا کا ایک اور رسول آجاتا تھا جو خدا کا نظام ان کے سامنے پھر سے رکھ دیتا اور اس طرح مذہب کو دین سے بدل دیتا تھا۔ لیکن حضورؐ نبی اکرم کی طرف نازل کردہ ضابطۂ حیات چونکہ مکمل، غیر متبدل، محفوظ اور تمام نوعِ انسان کے قیامت تک نظامِ خداوندی کا منشور تھا، اس لئے حضورؐ کے بعد کسی مامور من اللہ کے آنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان سے کہا گیا کہ اگر تمہارا دین بھی مذہب سے بدل جائے تو تمہارے سئے کرنے کا کام یہ ہو گا کہ تم قرآن کے متعین کردہ مقصد۔ یعنی دینِ خداوندی کو نظام ہائے عالم پر غالب کرنے کا مقصد از سر نو اپنے سامنے رکھ لو ــــ سمجھنے کی خاطر اسے "تجدیدِ مقصد" کہہ لیجئے۔ دیکھئے قرآن کریم اس عظیم حقیقت کو کس قدر بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا۔ آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَالْكِتَابِ الَّذِي نَزَّلَ عَلَىٰ رَسُولِهِ۔ (۴/۱۳۶) اس آیت کا عام ترجمہ یہ ہے کہ "اے ایمان والو! ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس لاؤ کتاب پر جسے اللہ نے اپنے رسول پر نازل کیا۔"

یہاں یہ بات بظاہر عجیب سی لگے گی کہ جن لوگوں کو خدا خود "اے ایمان والو" کہہ کر مخاطب کرتا ہے، انہیں ایمان لانے کے لئے کہا جا رہا ہے! یہ بڑی عظیم حقیقت ہے اور گہرے غور و فکر کی محتاج۔ جو قوم مذہب کی سطح پر اتر آتی ہے، لیکن اپنے آپ کو منسوب اسی دین کی طرف کرتی رہتی ہے قرآن انہیں دیگر مذاہب سے الگ کر کے، ان کے بلی تشخص کو تسلیم کرتا ہے۔ اس نہج سے انہیں "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" کہہ کر مخاطب کرتا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے خدا کے مقرر کردہ مقصد کو فراموش کر دیا ہوتا ہے اس لئے ان سے کہتا ہے کہ تم پھر سے اپنے سامنے اسی مقصد کو رکھ لو۔ اسی کو ہم نے "تجدیدِ مقصد" کہہ کر پکارا ہے۔ اس حقیقت کو سورۃ الصف میں مزید وضاحت سے بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

يُرِيدُونَ لِيُطْفِئُوا نُورَ اللَّهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَاللَّهُ مُتِمُّ نُورِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ۔ (۶۱/۸)

ان کے ارادے یہ ہیں کہ یہ خدا کے اس نور کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں۔ لیکن خدا اپنے نور کو مکمل کر کے رہے گا، خواہ یہ بات کفار (مخالفین) پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے۔

سوال یہ ہے کہ خدا کا یہ نور کیا ہے: جس کے بجھانے کی تدابیر مخالفین کرتے ہیں۔ اس کا جواب اگلی آیت میں دے دیا کہ:

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (۶۱/۹)

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور دین الحق (حق پر مبنی نظام) دے کر بھیجا تاکہ اسے تمام نظام ہائے عالم پر غالب کردے خواہ یہ بات مشرکین پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گذرے۔

اس سے ظاہر ہے کہ یہ نور جسے بجھانے (ناکام بنانے) کی سازشیں ہوں گیں، خدا کا متعین فردہ نظامِ زندگی ہے۔ اس کے بعد ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ (۱۰/۶۱)

اے ایمان والو! کیا ہم تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ نشان بتائیں جو تمہیں الم انگیز عذاب سے بچالے۔

وہ تجارت کیا ہے؟

تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ۔ (۱۱/۶۱)

یہ کہ تم ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر، اور اللہ کی راہ میں اپنے مال و جان کے ساتھ جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم اس حقیقت کو جان لو تو۔

اس کے بعد کہا کہ اس کے لئے تمہیں انصار اللہ بننا پڑے گا اور جب تم ایسے بن جاؤ گے تو تمہیں خدا کی نصرت اور فتح نصیب ہو جائے گی۔

اسلامی نظام کی مخالفت

سوال یہ ہے کہ خدا کا وہ کونسا نور ہے جسے بجھانے کے لئے مخالفین ہزار تدبیریں اور سازشیں کرتے ہیں! —— تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ اگر اسلام مذہب کی شکل میں رہے تو کوئی بھی اس سے تعرض نہیں کرتا۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی مکی زندگی میں سمجھا یہی جاتا تھا کہ یہ ایک "نیا مذہب" ہے۔ لہذا نہ تو اہلِ عرب نے اس کے خلاف کوئی اجتماعی اور منظم تدبیر کی اور نہ ہی ایران اور بازنطینی حکومتوں نے اس کا کوئی نوٹس لیا۔ لیکن مدنی زندگی میں جونہی اس نے ایک نظام کی شکل اختیار کرنا شروع کی، قریش بھی ہجوم کر کے اٹھ آئے اور ایران اور بازنطینی حکومتوں میں بھی اس کے خلاف حرکت پیدا ہوگئی۔ میں نے اپنے اس خطاب میں جو میں نے گذشتہ اگست میں یوم آزادی کی تقریب پر پیش کیا تھا اور جس کا عنوان تھا —— ہمارا ازلی دشمن —— اس حقیقت کو تاریخی شواہد کی روشنی میں واضح کیا ہے کہ مخالفین کی ساری کوششیں یہ چلی آرہی ہیں کہ اسلام بہ حیثیت مذہب تو بے شک زندہ رہے لیکن یہ نظام مملکت کی شکل نہ اختیار کرنے پائے۔ ہندوستان میں انگریز نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی کی ضمانت دی تھی۔ لیکن جب اس نے "وہابی تحریک" سے یہ خطرہ محسوس کیا کہ اسلام "دین کی حیثیت نہ اختیار کر جائے" تو اس نے اس کی روک تھام کے لئے "تحریک احمدیت" کھڑی کر دی اس نے جہاد بالسیف کو "جہاد اصغر" کہہ کر حرام قرار دیا اور اسلام کو بہ حیثیت مذہب باقی رکھنے کی کوششوں کو "جہادِ اکبر" کہہ کر پکارا۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس تحریک کی مخالفت کی، لیکن مذہب ہی کی سطح پر۔ اسلام بہ حیثیت دین ان کی نظروں سے بھی اوجھل رہا۔ ان حالات میں فطرت کی کرم گستری نے ہمارے ہاں ایک دیدہ ور پیدا کیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی روشنی میں "اسلام کا تصور بحیثیت دین کے پیش کیا اور جس امت کو "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا" کہہ کر خدا، رسول اور اس کی کتاب پر ایمان لانے "کے لئے کہا تھا۔ اس امت سے کہا کہ وہ اپنے مقصدِ حیات کی تجدید کرے اور نظامِ خداوندی کو دوبارہ متشکل کر کے اسے دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر کے دکھا دے۔ پاکستان کا نظریہ اقبال کی اسی دعوت کی عملی تشکیل کا نام تھا۔ ظاہر ہے کہ اس تصور کی مخالفت انگریز اور ہندو دونوں کی طرف سے ہونی تھی۔ یہ مخالفت ہوئی اور شدت کے ساتھ ہوئی۔ ہندو نے اس مقصد کے لئے مسلمان علماء کو اپنے ساتھ ملانے کے لئے انہیں اس امر کی ضمانت دے دی کہ آزادی کے بعد ہندوستان

ہیں سیکولر انداز کی حکومت قائم ہوگی جس میں امور مذہبی بدستور علماء کے ہاتھ میں رہیں گے۔ یہ تھی وہ جنگ جو اقبالؒ کو انگریز۔ ہندو۔ تحریکِ "احمدیت" اور نیشنلسٹ علماء کے خلاف لڑنی پڑی اور جسے ان کی وفات کے بعد طلوعِ اسلام نے جاری رکھا۔ اقبالؒ نے اسلام کو دین سے مذہب میں تبدیل کرنے کی سازش کو "ابلیسی" قرار دیا ہے، اور اسے اپنی مشہور نظم ــــ ابلیس کی مجلسِ شوریٰ ــــ میں ایسے محاکاتی انداز میں واضح کیا ہے کہ بصیرت اس پر وجد کرنے لگ جاتی ہے۔ وہ ہندی مسلمانوں کے خلاف اس سازش کو ابلیس کے ایک مشیر کی زبان سے یوں بیان کرتے ہیں کہ ؎

اس میں کیا شک ہے کہ محکم ہے یہ ابلیسی نظام
پختہ تر اس سے ہوئے خوئے غلامی میں عوام

ہے ازل سے ان غریبوں کے مقدر میں سجود
ان کی فطرت کا تقاضا ہے نمازِ بے قیام

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج
صوفی و مُلّا، ملوکیت کے بندے ہیں تمام

ہے طوافِ و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام

کس کی نومیدی پہ حجت ہے یہ فرمانِ جدید
"ہے جہاد اس دَور میں مردِ مسلماں پر حرام"

پاکستان میں مذہب

مذہب پرست گروہوں کی اس تمام مخالفت کے باوجود، پاکستان وجود میں آگیا تو یہ قوتیں بھی ساتھ ہی ادھر آگئیں۔ اگرچہ یہاں نیشنلسٹ علماء کے وابستگانِ داماں نے بھی کوشش جاری رکھی کہ یہاں اسلام بحیثیت مذہب ہی کے زندہ رہے، نظام کی شکل نہ اختیار کرنے پائے۔ لیکن اس باب میں منظم کوشش جماعتِ اسلامی کی طرف سے ہوئی، اسی طرح جس طرح ہندوستان میں تحریکِ مرزائیت نے اس کی مخالفت کی تھی۔ میں جانتا ہوں کہ میرے اس بیان پر بہت سی جبینیں شکن آلود ہو جائیں گی اور بہت سے قلوب ورطۂ حیرت میں ڈوب جائیں گے کہ میں نے جماعتِ اسلامی کو اس کے مخالفین کی صفِ اوّل میں شامل کر دیا ہے۔ لیکن جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ہمارے ہاں مشکل یہ ہے کہ ہم مذہب کے معاملہ میں بڑے سطحی بیں اور جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ جب مرزا غلام احمد نے اپنی تحریک کی ابتداء کی تو وہ اسلام کے پُرجوش مبلغ اور مناظر کی حیثیت سے سامنے آئے اور اپنی پہلی تصنیف "براہینِ احمدیہ" میں عیسائیوں اور آریوں کی بھرپور مخالفت کی۔ اس سے مسلمانوں نے اسے سر آنکھوں پر بٹھا لیا۔ حتیٰ کہ اس زمانے کے اچھے اچھے پڑھے لکھے لوگوں نے بھی، ان کی اسلامی خدمات کی بے حد تعریف کی۔ ان کی یہی تعریف تھی جسے اب "احمدی" حضرات مرزا صاحب کو حامیٔ اسلام ثابت کرنے کے لئے اچھال اچھال کر پیش کرتے ہیں حالانکہ (خود مرزا صاحب کے الفاظ ہیں) یہ ایک "پیچ" تھا جس میں یہ لوگ پھنس گئے تھے۔ یہی کچھ یہاں جماعتِ اسلامی کے ضمن میں ہو رہا ہے۔ اسے "اقامتِ دین" کے لئے جدوجہد کرنے والی پُرجوش جماعت سمجھا جاتا ہے حالانکہ ان کی ساری قوتیں اس بات کے لئے صرف ہو رہی ہیں کہ پاکستان میں قرآنی نظام قائم نہ ہونے پائے۔ اسلام مذہب ہی کی حیثیت سے باقی رہے۔ یہ موقعہ اس کی تفصیل میں جانے کا نہیں۔ ویسے بھی طلوعِ اسلام اس باب میں پچیس سال سے مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہے۔ اس وقت میں صرف ایک نکتہ پر اکتفا کروں گا۔ دین الحق یا اسلامی نظام کے معنی ہیں، خدا کی کتاب (قرآن مجید) کی حکمرانی جس میں مذہب اور سیاست، دین اور دنیا میں ثنویت نہیں ہوتی۔ مودودی صاحب پاکستان میں اسلامی نظام کا یہ خاکہ پیش کر رہے ہیں کہ:

(۱) پرسنل لاز ہر فرقے کے اپنے اپنے ہوں۔

(۲) پبلک لاز کتاب و سنت کے مطابق وضع ہوں۔

آپ سوچیئے کہ پرسنل اور پبلک لاز میں یہ تفریق، مذہب کی ایجاد ہے یا نظامِ خداوندی کا تقاضا؟

اب آگے بڑھئے۔ انہوں نے کہا کہ پبلک لاز "کتاب و سنت" کے مطابق ہوں۔ لیکن بیس سال تک یہ ڈھول اڑانے کے بعد کہہ دیا کہ کتاب و سنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کر لیں۔ یا للعجب؟... اس پر سوال پیدا ہوا کہ پھر کیا کیا جائے۔ جواب ملا کہ چونکہ ملک کی اکثریت حنفی المسلک ہے اس لئے یہاں فقہ حنفی نافذ کر دی جائے ۔ اس پر ان فرقوں کی طرف سے شور مچ گیا جو فقہ حنفی کے قائل نہیں۔ مثلاً اہلحدیث اور شیعہ حضرات۔

اس ایک نکتہ سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ یہ جماعت یہاں نظامِ خداوندی قائم کرنا چاہتی ہے یا مذہب کی جس کی شکل میں اسلام چلا آ رہا ہے اسی کو باقی اور قائم رکھنا! اور اس سے آپ اس کا اندازہ بھی لگا لیجئے کہ کیا یہ وہی گہری سازش نہیں کہ مسلمانوں کو ایک ایسی مملکت مل جانے کے بعد بھی جسے انہوں نے نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے حاصل کیا تھا۔ یہاں وہ نظام قائم نہ ہو سکے۔ اسلام بدستور مذہب کی شکل میں باقی رہے۔!

جس طرح غیر منقسم ہندوستان میں، اس سازش کے خلاف طلوعِ اسلام نے آواز بلند کی تھی، اسی طرح یہاں بھی اس کے خلاف طلوعِ اسلام ہی کی آواز بلند ہو رہی ہے۔ اس سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ جماعت اسلامی کی طرف سے میرے خلاف جو اس شد و مد سے مسلسل پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے اس کی حقیقی وجہ کیا ہے ..... اس میں سوال نہ انکار و اقرارِ حدیث کا ہے، نہ اتباع و مخالفت سنت کا۔ نہ تین وقتوں کی نماز کا نہ لونڈیوں کے رد و بدل کا۔ یہ سب جھوٹے الزامات ہیں جو میرے خلاف ایک خاص پلان کے تحت تراشے گئے ہیں۔ مقصد اس سے یہ ہے کہ عوام میری آواز سننے نہ پائیں اور اس طرح ان کی یہ سازش بے نقاب نہ ہو سکے۔

سکولرازم کا نظام

اس وقت عزیزانِ من! ساری دنیا میں ایک ہی نظام رائج ہے جسے سیکولرازم کا نظام کہا جاتا ہے۔ اس نظام کا ملخص یہ ہے کہ انسانی معاملات کے حل کے لئے وحی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ انہیں انسان اپنی عقل و فکر کی رو سے خود حل کر سکتا ہے۔ یورپ کی عیسائی سلطنتیں ہوں یا ان سے متاثر مسلمانوں کی مملکتیں۔ بھارت کی سناتنی حکومت ہو یا روس اور چین کا مبنی بر دہریت نظام۔ ان سب میں قدرِ مشترک یہی عنصر ہے کہ انسانی معاملات کے حل کے لئے وحی کی ضرورت نہیں ۔

مذہب چونکہ انسانی معاملات میں دخل نہیں دیتا اس لئے یہ مملکتیں کسی مذہب سے بھی تعرض نہیں کرتیں اور تو اور روس اور چین میں بھی مسلمانوں کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ لیکن یہ لوگ جانتے ہیں کہ ان کے اس نظام کا کوئی نظام مقابلہ کر سکتا ہے اور اس پر غالب آ سکتا ہے تو وہ قرآن کا پیش کردہ نظام ہے۔ اس لئے ان سب کا مشترکہ مقصد اور متحدہ کوشش یہ ہے کہ یہ نظام کہیں بھی قائم نہ ہونے پائے۔ اس کا امکان پاکستان میں تھا، کیونکہ یہ ایک ایسا خطۂ ارض تھا جس میں پہلے کوئی نظام قائم نہ تھا اور اس کا تصور دینے والوں اور مطالبہ پیش کرنے والوں کے سامنے مقصد یہی تھا کہ اس سرزمین میں قرآنی نظام قائم کیا جائے۔ اس مقصد کو ناکام بنانے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ یہاں مذہب کا جال اس وسیع پیمانے پر پھیلا دیا جائے کہ کوئی اس سے نکلنے ہی نہ پائے۔ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ تشکیل پاکستان کے وقت یہاں مذہبی پیشوائیت کی حالت کیا تھی اور آج اس کا پھیلاؤ کس قدر ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ کچھ نہ قربانی کی کھالوں سے ہو سکتا ہے، نہ مسجد کی صندوقچیوں کے چندوں سے۔ اس کے لئے تو "دستِ غیب" کی ضرورت ہوتی ہے۔ مرزا صاحب نے بھی یہی کہا تھا کہ میری حالت یہ تھی کہ دس روپے کی آمدنی کی بھی توقع نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب زر و سیم میری طرف سیلاب کی طرح امنڈے چلا آ رہا ہے۔ مذہب اسی قسم کے سہاروں سے قائم رہتا اور آگے بڑھتا ہے۔

اور یہ ہیں عزیزانِ من! وہ جگر کاوی جن میں آپ قرآنی دعوت کے اس ننھے سے دیئے کو جلاتے چلے آ رہے ہیں اور جس میں دنیاوی اسباب و ذرائع کا تیل نہیں، خود آپ کا خونِ جگر جلتا ہے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں ؎

وہ مرد درویش جس کو حق نے دیئے ہیں انداز خسروانہ — ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے

اس بے سروسامانی کے باوجود آپ کی اس استقامت کا نتیجہ ہے کہ خدا کی کائناتی قوتیں جنہیں زمانے کے تقاضے کہہ کر پکارا جاتا ہے آپ کی ہم نوا ہیں اور "احمدیوں" کے متعلق حالیہ فیصلہ اس کی تازہ ترین شہادت ہے۔ یہ فیصلہ اس لحاظ ہی سے اہم نہیں کہ یہی سنے جو آواز آج سے چالیس سال پہلے اٹھائی تھی اور بہاولپور کی ایک عدالت نے اس کے مطابق "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دیا تھا (اور جس مطالبہ کو علامہ اقبالؒ نے ایک تحریک کی شکل میں پیش کیا تھا) اسے مملکتِ پاکستان نے آئینی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ اس کی اہمیت اس لحاظ سے بہت زیادہ ہے کہ یہ پاکستان میں ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں اقدام ہے جس کے نتائج اور عواقب بڑے دُور رس ہیں۔ اسے غور سے سنئے۔

احمدیوں کے متعلق فیصلہ

میں نے ابھی ابھی کہا ہے کہ اسلام کے خلاف سازش یہ ہوئی تھی کہ اسے دین کی جگہ مذہب میں تبدیل کر دیا گیا۔ دین میں مذہب اور سیاست میں ثنویت نہیں ہوتی۔ تمام امور کا فیصلہ اسلامی مملکت کرتی ہے۔ مذہب میں حکومت اور مذہبی پیشوائیت میں ایک سمجھوتہ ہوتا ہے جس کی رو سے مذہبی امور، مثل اعتقادات، عبادات، پرسنل لاز وغیرہ، مذہبی پیشوائیت کے دائرہ اقتدار میں رہتے ہیں اور دنیاوی امور حکومت کے اختیار میں۔ مسلمانوں میں، صدرِ اول کے بعد یہ ثنویت پیدا ہوئی اور مسلسل آگے بڑھتی گئی۔ یہی کیفیت انگریزی عمل داری میں ہندوستان میں بھی قائم تھی، اس فرق کے ساتھ کہ اس سے پہلے مذہبی پیشوا جسے قتل کرنا چاہتے تھے (یا مملکت جسے قتل کرانا چاہتی تھی) یہ حضرات اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر کے اُسے مرتد قرار دے دیتے تھے اور مُرتد کی سزا، ان حضرات کی شریعت کی رو سے قتل تھی (قرآن کی رو سے ایسا نہیں) انگریزوں نے اس طرح کے قتل کو تو روک دیا لیکن ان حضرات نے کفر سازی کے اپنے مشغلہ کو جاری رکھا۔ اس سے صرف ان کے جذبۂ انتقام و نفرت کی تسکین ہوتی تھی۔ عملاً اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جس کے خلاف یہ کفر کا فتویٰ صادر کرتے تھے وہ مسلمان کا مسلمان ہی تصور ہوتا اور تسلیم کیا جاتا تھا۔ (مثلاً) ہمارے مذہبی فرقوں میں سے کوئی فرقہ ایسا نہیں جس پر فریقِ مخالف نے کفر کا فتویٰ نہ لگایا ہو۔ لیکن اس کے باوجود ان فرقوں سے وابستہ سب مسلمان تسلیم کئے جاتے ہیں۔

میں ان حضرات کی خدمت میں بار بار عرض کرتا رہا کہ آپ اپنا وقت اور توانائیوں کفر سازی کے اس بے کار اور تخریبی مشغلہ میں ضائع کرنے کے بجائے یہاں قرآن کا نظام نافذ کرنے کے لئے کوشش کریں اور پھر دیکھیں کہ جو "فتویٰ" حکومت کی طرف سے صادر ہوتا ہے وہ کس قدر مؤثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اسے کس طرح مان لیتے۔ ان کا تو مسلک ہی قرآنی نظامِ خداوندی کی مخالفت تھا۔

طوعاً نہیں تو کرہاً

قرآن کریم میں ہے۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا ...... (13/15)

کائنات میں جو کوئی بھی ہے اسے قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنا ہے۔ جو طوعاً ایسا نہیں کرتے انہیں کرہاً ایسا کرنا پڑتا ہے۔

جب ان حضرات نے طوعاً ایسا نہ کیا تو فطرت کے پروگرام نے ان سے کرہاً ایسا کرایا — مسئلہ ختم نبوت کے سلسلہ میں یہ حضرات ۱۹۵۳ء کے ہنگامے کے بعد خاموش بیٹھے تھے کہ ربوہ اسٹیشن کا حادثہ نمودار ہو گیا جس نے ملک میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ اس تزلزل اور ارتعاش میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ملک کے تمام فرقوں کے علماء حضرات حکومت سے درخواست کر رہے بلکہ اسے مجبور کر رہے ہیں کہ وہ "احمدیوں" کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرے۔ یعنی یہ حضرات اپنے اس حق اور اقتدار سے جسے چھوڑنے کا یہ کبھی تصور بھی نہیں کرتے تھے از خود دستبردار ہو کر اسے حکومت کے سپرد کر رہے ہیں اور حکومت پر زور دے رہے ہیں کہ وہ اس اختیار کو استعمال کرے۔ جیسا کہ میں

نے اسی ماہ (اکتوبر) کے طلوعِ اسلام کے لمعات میں لکھا ہے۔ یہ حضرات حکومت پر زور دے رہے تھے اور ہمیں فطرت کی اس ستم ظریفی پر زیرِ لب خنداں تھا کہ یہ نہ صرف حکومت پر زور دے رہے ہیں بلکہ اُس بھٹو پر زور دے رہے ہیں کہ وہ "احمدیوں" کے کفر و اسلام کا فیصلہ کرے جسے ابھی کل ہی یہ کافر قرار دے چکے ہیں۔ حکومت نے اس اختیار کو سنبھالا اور فیصلہ دے دیا جس پر ان حضرات نے حکومت اور مسٹر بھٹو کو مبارک باد کے تار دیئے۔ اس طرح انہوں نے خود دیکھ لیا کہ ان کی طرف سے کفر کے فتوے صادر کرنے اور حکومت کی طرف سے فیصلہ کرنے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ نوے برس سے فتوے صادر کرتے رہے تو "احمدیوں" کا کچھ نہ بگڑا۔ حکومت نے ایک فیصلہ کیا اور وہ غیر مسلموں کی صف میں شامل ہو گئے۔

یہ ہے عزیزانِ من! وہ اقدام جسے میں نے انقلابی قرار دیا ہے۔

انقلابی اقدام

ہماری تاریخ میں یہ پہلا واقعہ ہے جو مذہبی پیشوائیت نے تسلیم کیا ہو کہ اعتقادات کے غلط اور صحیح ہونے کے متعلق فیصلہ کرنا مذہبی پیشوائیت کا نہیں، حکومت کا حق ہے! کہیئے، قافلۂ قرآنی کے رفیقو! یہ عظیم انقلابی اقدام ہے یا نہیں جو اس طرح ظہور میں آیا ہے؟ اور آپ نے اس کے لئے پچیس سال سے جو تگ و تاز شروع کر رکھی تھی بارگاہِ خداوندی سے اس کی قبولیت کی نوید جانفزا آپ کو مل گئی ہے یا نہیں؟ خدا کی اس نعمتِ عظمےٰ پر میں آپ تمام رفقاء کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔ مبارک ہیں وہ جو اپنی زندگی میں اپنی مساعی کو ثمر بار ہوتا دیکھ لیں۔ یہ پہلا قدم در حقیقت ایک نظیر (PRECEDENT) ہے جو قائم ہو گئی ہے اس امر کے لئے کہ جن امور کو "مذہبی معاملات" کہہ کر پیشوائیت کی تحویل میں دیتی تھی، ان میں بھی فیصلہ کا حق حکومت ہی کو ہے۔

اس نظیر کے قائم ہونے کا نتیجہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایئے کہ سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی ساری عمر یہ کہتے ہوئے گذر گئی کہ حکومت کا حق صرف صالحین کو حاصل ہے اور صالحین سب ان کی جماعت میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ وہ انہیں یہ کہہ کر اقتدارِ حکومت سنبھالنے کے لئے تیار کرتے رہے ہیں کہ:

> تم خلقِ خدا کی اصلاح کے لئے اٹھو۔ حکومت کے غلط اصول کو صحیح اصول سے بدلنے کی کوشش کرو۔ ناخدا ترس اور شتر بے مہار قسم کے لوگوں سے قانون سازی اور فرماں روائی کا اقتدار چھین لو اور بندگانِ خدا کی سربراہی اپنے ہاتھ میں لے کر، خدا کے قانون کے مطابق آخرت کی ذمہ داری و جواب دہی کا اور خدا کے عالم الغیب ہونے کا یقین رکھتے ہوئے حکومت کے معاملات انجام دو۔۔۔ اسی کوشش اور جد و جہد کا نام جہاد ہے۔ (خطبات ص ۲۳۴)

اب وہی مودودی صاحب فرما رہے ہیں کہ جن لوگوں نے "احمدیوں" کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے۔

> اللہ تعالیٰ انہی کو اسلامی قوانین کے نفاذ کا ذریعہ بنائے۔ مسٹر بھٹو اپنے ہاتھ سے یہ کام انجام دیں۔ ہم اس بات کے حق میں نہیں کہ حکومت ہمارے ہاتھ میں آئے اور اسلامی نظام کا نفاذ ہمارے ہی ہاتھوں سے ہو۔ جو شخص یا جماعت بھی یہ کام انجام دیتی ہے وہ ہماری محسن ہے۔
>
> (ایشیا ۲۲ ستمبر ۱۹۷۴ء)

سوچیئے عزیزانِ من! کہ یہ کوئی معمولی درجہ کا انقلاب ہے! میری آنکھیں تو کچھ اور دیکھنے لگ گئی ہیں۔ ؎

آثار بتاتے ہیں سحر ہو کے رہے گی

پاکستان کے دستور میں یہ شق پہلے سے موجود ہے کہ مملکت اپنے اختیارات کا استعمال خدا کی مقرر کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے کرے گی۔ جب حکومت "مذہبی معاملات" کے فیصلے اس اصول کے مطابق کرنے لگ گئی تو اس سے رفتہ رفتہ مملکت صحیح معنوں میں اسلامی بن جائے گی اور مذہبی پیشوائیت کا وجود اور تصور ختم ہو جائے گا۔ اس طرح سے

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش　　اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے　　یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

اور دنیا دیکھ لے گی کہ قرآن کا یہ دعویٰ کس طرح مبنی برحقیقت ہے کہ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ (۶۱/۸)

مسلمان کی تعریف

اب میں اس فیصلہ کے دیگر تضمنات کی طرف آتا ہوں۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ جو شخص حضور نبی اکرم کو خدا کا آخری رسول نہ مانے اور خود مدعی نبوت ہو، وہ بھی دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور جو شخص ایسے مدعی نبوت کو نبی یا مذہبی مصلح تسلیم کرے وہ بھی غیر مسلم۔ یہ منفی تعریف (NEGATIVE DEFINITION) ہے۔ یعنی اس میں یہ کہا گیا ہے کہ اس قسم کا عقیدہ رکھنے والا شخص مسلمان تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ بتایا جائے کہ مسلمان کسے تسلیم کیا جائے گا؟ مسلمان ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں؟ — یہ سوال نہایت اہم ہے۔ ۱۹۵۳ء میں تحریک ختم نبوت کی کشتی اسی چٹان سے ٹکرا کر ٹوٹی تھی۔ ہمارے علماء کرام یہ نہیں بتا سکے تھے کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟ پاکستان کے آئین میں یہ شق شامل ہے کہ مملکت کا دین اسلام ہے۔ یہ بھی کہ (کم از کم) صدر اور وزیر اعظم کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے۔ جس طرح ختم نبوت کے منکرین کو غیر مسلم قرار دینا تقاضائے آئین تھا اسی طرح یہ متعین کرنا بھی آئین کا تقاضا ہے کہ مسلمان کسے تسلیم کیا جائے گا۔ اس مثبت تعریف (POSITIVE DEFINITION) سے بہت سی اُلجھنیں دُور ہو جائیں گی۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص خدا کو نہیں مانتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا تصور جاگیردارانہ نظام کا وضع کردہ واہمہ ہے۔ فلاں شخص وحی کا قائل نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ محمد ابن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ایک ذہین مدبر اور (GENIUS) تھے اور قرآن (معاذ اللہ) ان کی اپنی فکری تخلیق ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ کوئی نظریۂ اصول، قدر یا قانون ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سوسائٹی کے وضع کردہ ہوتے ہیں اور سوسائٹی کو حق ہے کہ جو قانون چاہے وضع کرے اور جس میں چاہے تغیر و تبدل کر دے۔ کوئی کہتا ہے کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ مرنے کے بعد کی زندگی محض ایک اخلاقی دباؤ ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ یہ لوگ یہ سب کچھ کہتے ہیں اور اس کے باوجود مسلمان کہلاتے اور مسلمان سمجھے جاتے ہیں۔ ہماری مملکت کی بنیاد اسلام پر ہے — ابھی اگلے دنوں مسٹر بھٹو نے ایک امریکن رپورٹر کو انٹرویو دیتے ہوئے بھی کہا ہے کہ ہماری مملکت کا وجود ہی اسلام کا رہین منت ہے۔ (بحوالہ پاکستان ٹائمز۔ مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۷۴ء) سو جب ہماری مملکت کی پوزیشن یہ ہے۔ تو مملکت کے لئے ضروری ہے کہ جس نظریہ پر اس کی اساس و بنیاد ہے اس کی وضاحت کرے اور یہ متعین کرے کہ اس نظریہ کا حامل کسے سمجھا جائے گا، اور اس کا منکر کسے۔ یہ اسی طرح ضروری ہے جس طرح یہ متعین کرنا ضروری ہے کہ پاکستان کا نیشنل کون ہے۔ جب یہ متعین ہو جائے گا تو پھر یہ بھی طے ہو جائے گا کہ کون کون سے بنیادی نظریات اور اصول ہیں جن کے خلاف کچھ کہنا، کرنا یا ان

کی نشرواشاعت قانوناً جرم اور مستوجب سزا ہے۔ اس وقت معاشرہ میں اسلام کے خلاف جو ہفوات و خرافات کی عام نشرواشاعت ہو رہی ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم نے اسے متعین نہیں کیا کہ اسلام کے بنیادی نظریات کیا ہیں جن کے خلاف کچھ کہنا قانوناً جرم ہے۔ ہمارا مطلب یہ نہیں کہ یہاں مذہب کے نام پر (WITCH-HUNTING) شروع کر دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ متعین کیا جائے کہ فلاں نظریات اسلام کی اصل و اساس ہیں۔ ان کا ماننے والا مسلمان تسلیم کیا جائے گا اور مملکت اسلامیہ پاکستانیہ میں ان کے خلاف خیالات و نظریات کی اشاعت قانوناً جرم متصور ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر اس قسم کے اقرار نامہ کو آئین میں شامل کر دیا جائے تو یہ مسلمان ہونے کے لئے کافی ہوگا۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ

> قرآن مجید جو اپنے زمانۂ نزول سے ...... مسلمانوں میں محفوظ چلا آرہا ہے، خدا کی طرف سے اُس کے آخری نبی محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل شدہ آخری وحی ہے۔ یہ تمام نوعِ انسان کے لئے قیامت تک، واحد، مکمل، غیر متبدل، غیر محرف ضابطۂ حیات، حق و باطل کا معیار اور زندگی کے تمام معاملات کے لئے قولِ فیصل اور حکم ہے، اور ہماری انفرادی اور اجتماعی آزادی اور پابندی کے ابدی حدود متعین کرتا ہے اور اس کا ایک ایک لفظ صداقت پر مبنی ہے۔

اس مثبت اقرار نامہ کے ساتھ جب اُس منفی تعریف کو شامل کر لیا جائے جس کی رو سے ختمِ نبوت کے منکر کو غیر مسلم قرار دیا گیا ہے تو اس سے مسلمان کی تعریف بھی جامع ہو جائے گی اور مسلم اور غیر مسلم میں امتیاز بھی بالکل واضح۔ میرا خیال ہے کہ اس تعریف (DEFINITION) سے کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا۔

اسلامی نظریات کے خلاف تبلیغ

پارلیمان کی خصوصی کمیٹی نے سفارش کی ہے کہ ایسا قانون نافذ کیا جائے جس کی رو سے کسی مسلمان کو اجازت نہ ہو کہ وہ ختمِ نبوت کے خلاف خیالات یا عقائد کی نشرواشاعت کرے۔ ایسا کرنے والا سزا کا مستوجب قرار دیا جائے۔ جیسا کہ میں نے طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۷۴ء کے لمعات میں تفصیل سے بتایا ہے۔ اس تجویز میں ایک بنیادی سقم ہے۔ اس میں یہ پابندی صرف مسلمان پر عائد کی گئی ہے۔ سو اوّل تو جو شخص ختمِ نبوت کے خلاف کچھ کہے گا وہ حالیہ فیصلہ کی رو سے مسلمان ہی نہیں رہے گا، غیر مسلم قرار پا جائے گا۔ اس لئے اس پر اس قانون کا اطلاق نہیں ہو سکے گا۔ دوسرے یہ کہ "احمدی" حضرات اس سے بالکلیہ مستثنےٰ قرار پا جائیں گے کیونکہ اس کا اطلاق صرف مسلمانوں پر ہوگا اور انہیں غیر مسلم قرار دے دیا گیا ہے۔ صحیح تدبیر یہ ہے کہ (جیسا کہ میں نے ابھی ابھی کہا ہے) اس کا تعین ہونا چاہیئے کہ مسلمان ہونے کی اساسی شرائط کیا ہیں۔ (انہیں میں ختمِ نبوت کے عقیدہ کو بھی شامل کر لینا چاہیئے) اور اس کے بعد قانون یہ نافذ ہونا چاہیئے کہ جو شخص ان اساسات کے خلاف کچھ کہے گا یا اس کی نشرواشاعت کرے گا سزا کا مستوجب ہوگا۔ خواہ وہ مسلمان ہو اور خواہ غیر مسلم۔ اسلامی مملکت میں اسلامی اساسات کے خلاف کچھ کہنا یا ان کی تحقیر یا استہزا کرنا۔ مملکت کے خلاف بغاوت کے مترادف ہوتا ہے۔ نہ ہی کسی غیر مسلم کو اس کی اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے کسی خیال، عقیدہ یا نظریہ کو اسلامی کہہ کر اس کی اشاعت کرے، اپنے آپ کو مسلمان کہے یا مسلمانوں جیسے نام رکھے۔

دو قومی نظریہ

مطالبہ یہ کیا جا رہا ہے کہ "احمدیوں" کو کلیدی اسامیوں سے الگ کیا جائے اور ملازمتوں میں انہیں ان کی آبادی کے تناسب سے حصہ دیا جائے۔ اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ دستور پاکستان کی رُو سے ایسا کیا نہیں جا سکتا۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ملازمتوں کے معاملہ میں مذہب کی بنا پر کوئی اختصاص نہیں کیا جائے گا۔ یہ درست ہے دستور پاکستان میں ایسا ہی کہا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ میں شروع سے کہتا چلا آ رہا ہوں، پاکستان میں ابتدا ہی سے اس کے ایک بنیادی نظریہ کے خلاف عمل ہو رہا ہے۔ وہ بنیادی نظریہ ہے۔ دو قومی (TWO NATION THEORY) ہم نے پاکستان کا مطالبہ اسلام کے اس اساسی نظریہ کی رو سے کیا تھا کہ کسی ملک (بلکہ ساری دنیا) میں بسنے والے مسلم اور غیر مسلم ایک قوم کے افراد قرار نہیں پا سکتے۔ مسلمان، دین کی اشتراک کی بنا پر غیر مسلموں سے الگ منفرد قوم ہیں۔ اسی مطالبہ کے منوانے سے ہم نے پاکستان حاصل کیا تھا۔ لیکن یہاں پہنچ کر ہم نے پہلے ہی دن سے عمل اس کے خلاف شروع کر دیا۔ ہم نے پاکستان میں بسنے والے مسلموں اور غیر مسلموں کو اشتراکِ وطن کی بنا پر ایک قوم تسلیم کر لیا اور تماشا یہ کہ اس کے ساتھ ہی ہم "دو قومی نظریہ" کے الفاظ بھی برابر دہراتے رہے (اور دہراتے چلے جا رہے ہیں) ظاہر ہے کہ جب آپ پاکستان میں بسنے والے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو ایک قوم تصور اور تسلیم کریں گے تو جو حقوق ساری قوم کے لئے کھلے ہوں گے۔ ان میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز و تخصیص کس طرح کر سکیں گے۔ یہی وجہ ہے جو "احمدیوں" کو غیر مسلم قرار دینے کے باوجود آپ ملازمتوں وغیرہ کے معاملہ میں "محض اختلاف مذہب کی بنا پر" ان کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے۔ اس کا علاج دو قومی نظریہ کا عملاً نفاذ ہے جس کی رو سے اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کو شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ یہ قرآن کریم کا واضح فیصلہ ہے۔ غیر مسلموں کے حقوق و مراعات متعین ہوں گے اور ان کی حفاظت و ضمانت مملکت کا فریضہ۔ لیکن وہ شریکِ حکومت نہیں ہو سکیں گے۔ انہی میں "احمدیوں" کا شمار ہو گا۔

اکثریت و اقلیت

موجودہ زمانے کی سیاست میں اکثریت اقلیت (میجارٹی، مینارٹی) کا قصہ بھی عجیب ہے۔ سیکولر نظام کی رو سے، ایک ملک کے باشندے ایک قوم متصور ہوتے ہیں۔ انتخابات کے نتیجہ میں اس قوم کی جس پارٹی کو زیادہ ووٹ مل جائیں وہ اکثریتی پارٹی کہلاتی ہے، جسے کم ملیں وہ اقلیت کہلاتی ہے۔ یہ اکثریت اقلیت انتخابی نتائج کے مطابق ادلتی بدلتی رہتی ہے۔ ہندوستان میں بھی یہی سیکولر نظام رائج ہے جس کی رو سے ملک کے سارے باشندے بلا لحاظ مذہب ایک قوم شمار ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہاں مسلمان، عیسائی، پارسی وغیرہ مینارٹیز کہلاتے ہیں۔ کیونکہ بلحاظ آبادی ہندوؤں کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم ہے —— یعنی مملکت سیکولر ہے لیکن اس میں میجارٹی، مینارٹی کا تعین مذاہب کی رو سے ہوتا ہے۔ کیسی عجیب ہے یہ بات؟ پاکستان میں دو قومی نظریہ کے الفاظ دہرائے جاتے ہیں لیکن عملاً یہاں بھی بعینہٖ وہی کچھ ہو رہا ہے جو ہندوستان میں کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہاں مسلم اور غیر مسلموں کو دو الگ الگ قومیں شمار نہیں کیا جاتا۔ کثرتِ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کو اکثریت اور غیر مسلموں کو اقلیت کہا جاتا ہے۔ "احمدیوں" کے متعلق فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ:

> یہ فیصلہ مذہبی بھی ہے اور سیکولر بھی۔ سیکولر اس معنی میں کہ ہم عصر جدید میں بستے ہیں اور ہمارا دستور سیکولر ہے۔ کیونکہ ہمارا ایمان ہے کہ ملک کے تمام شہری یکساں سلوک کے حقدار ہیں۔
>
> (بحوالہ ایشیا مورخہ ۲۲ ستمبر ۱۹۷۴ء)

مملکت اسلامی ہے اور دستور سیکولر ہے؟ یا للعجب! حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظامِ سیاست کے متعلق ہمارے ان نہ مذہبی پیشوائیت کا ذہن صاف ہے، نہ سیاسی رہنماؤں کا ـــ وہ پرسنل اور پبلک لاز میں ثنویت کے قائل ہیں اور یہ غیر مسلم اور مسلم سب کو ایک قوم شمار کرتے ہیں اور تماشا یہ کہ دونوں اسلام کو مملکت کی بنیاد قرار دیتے ہیں حالانکہ یہ دونوں خصوصیات سیکولر نظام کی ہیں۔ سچ کہا تھا اقبالؒ نے کہ ؎

نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

ذہن صاف، قرآن کریم کی روشنی میں ہو سکتا ہے اور اسی سے ان کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔

اہلِ کتاب کی حیثیت

یہ آوازیں بھی سننے میں آتی ہیں کہ "احمدیوں" کی پوزیشن "اہلِ کتاب" کی سی ہو گئی ہے ـــ یہ غلط ہے۔ اس سلسلہ میں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ "اہلِ کتاب" کسے کہتے ہیں۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے دنیا کی ہر قوم کی طرف انبیائے کرام آتے رہے اور اپنی اپنی کتاب لاتے رہے۔ ان میں سے کچھ نبیوں کا ذکر قرآن کریم میں بصراحت آیا ہے اور باقیوں کا بصراحت نہیں آیا۔

ان کا ذکر بصراحت کیا گیا ہو یا نہ، مسلمان یہ تسلیم کرنے کے لئے مکلف ہیں کہ یہ انبیائے کرامؑ خدا کی طرف سے آتے رہے تھے۔ ان میں سے قرآن کریم نے یہود اور نصاریٰ کو بصراحت "اہلِ کتاب" کہہ کر پکارا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اہلِ کتاب صرف یہ دونوں گروہ کہلا سکتے ہیں، لیکن دوسروں کا خیال ہے کہ دیگر اہلِ مذاہب بھی اس زمرہ میں آ سکتے ہیں۔ سردست میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا کیونکہ یہ تمام انبیاء اور ان کے نام لیوا حضورؐ نبی اکرم سے پہلے ہو گذرے ہیں۔ حضورؐ کے بعد کوئی نبی نہیں آ سکتا اور جب نبی نہیں آ سکتا تو کوئی "اہلِ کتاب" بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر حضورؐ کے بعد دنیا کی کسی جماعت کو "اہلِ کتاب" تسلیم کیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اجرائے نبوت کے قائل ہیں۔ مثلاً بہائیوں کا دعویٰ ہے کہ بہاء اللہ نبی تھا اور ایک کتاب بھی لایا تھا۔ لیکن انہیں اہلِ کتاب تسلیم نہیں کر سکتے کیونکہ ہم بہاء اللہ کو سچا مدعیٔ نبوت مانتے ہی نہیں۔ رسول اللہ کے بعد دنیا کی کسی قوم میں کوئی شخص دعوائے نبوت کرے، ہم اسے جھوٹا مدعیٔ نبوت کہیں گے۔ جب ہم اسے جھوٹا مدعیٔ نبوت قرار دیں گے تو اس کے متبعین کو "اہلِ کتاب" کیسے تسلیم کیا جا سکے گا۔ یہی پوزیشن "احمدیوں" کی ہے۔ انہیں "اہلِ کتاب" تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

باقی رہے اس قسم کے سوالات کہ ان کے ساتھ جو رشتے ناطے ہو چکے ہیں ان کی صورت کیا ہو گی، تو ان کا تعلق قانون سے ہے۔ اس لئے انہیں حکومت یا عدالت مجاز ہی طے کر سکتی ہے۔ انفرادی آراء خواہ انہیں مذہبی فتوے ہی کیوں نہ کہہ لیا جائے اس باب میں قولِ فیصل قرار نہیں پا سکتیں۔

حرفِ آخر

آخر میں میرا روئے سخن پھر اپنے قرآنی احباب کی طرف ہے۔ ہم نے عزیزانِ من! اس آواز کو اس زمانے میں اٹھایا جب ہم نوائی تو ایک طرف اس کی صدائے بازگشت بھی کہیں سے سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس کے برعکس اس کی مخالفت اس شدت سے ہوئی کہ اس کا آگے بڑھنا یا اثر انداز ہونا تو ایک طرف اس کے زندہ رہنے کے بھی بظاہر کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ ہمارے بعض ہم سفر اس کی نتیجہ خیزی کی طرف سے مایوس ہو کر الگ ہو گئے۔ بعض اس کی سست رفتاری کی وجہ سے تھک کر بیٹھ گئے۔ بعض شارٹ کٹس (پگ ڈنڈیوں) کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے۔ لیکن میں آپ احباب کی ہمت کی داد دیتا

ہوں کہ مخالفتوں کے اس تمام ہجوم اور نامساعد حالات کے اژدہام کے باوجود آپ کے پائے استقامت میں ذراسی بھی لغزش نہ آئی اور آپ اس ننھے سے دیئے کو چراغِ راہ بنائے ہوئے مسلسل آگے بڑھتے چلے گئے۔ یہ سب اس یقینِ محکم کی بدولت تھا کہ ہم نے اپنے سامنے جو منزل رکھی ہے وہ بھی برحق ہے اور اس تک پہنچنے کے لئے جو راستہ اختیار کیا ہے وہ بھی مبنی برصداقت ہے۔ آپ کے اس یقینِ محکم اور عملِ پیہم کا نتیجہ ہے کہ دُھند چھٹ رہی ہے، تاریکیاں کافور ہو رہی ہیں اور نشاناتِ منزل ابھر اور نکھر کر دکھائی دینے لگ گئے ہیں۔

آپ ذرا اس ایک واقعہ پر غور کیجئے کہ ۱۹۳۵ء میں بہاولپور کی ایک ریاست نے میرے ایک مقالہ پر مبنی یہ فیصلہ دیا تھا کہ مرزا غلام احمد کو نبی ماننے والے دائرۂ اسلام سے خارج ہیں۔ میں نے اپنی اس آواز کو غیر منقسم ہندوستان میں بھی جاری رکھا اور تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی اسے دہراتا چلا آیا کہ یہ حکومت کا فریضہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم کا فرق متعین کرے، اور ختمِ نبوت کو ان دونوں میں حدِ فاصل قرار دے۔ آج چالیس سال کے بعد اس مطالبہ کو حکومت کی طرف سے تسلیم کیا گیا — چالیس سال کا عرصہ مختصر عرصہ نہیں ہوتا۔ یہ تو انسان کی طبعی زندگی کا نصف سے بھی زیادہ حصہ ہوتا ہے۔ میری نصف زندگی اس میں صرف ہو گئی، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری ساری زندگی بھی اس میں صرف ہو جاتی اور آخری سانس میں بھی یہ نشیدِ جانفزا میرے کان میں پڑ جاتی تو میں شاداں و فرحاں، یہ کہتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوتا کہ — شادم از زندگیٔ خویش کہ کارے کردم — تحفظِ ناموسِ رسالتؐ میرے ایمان کا تقاضا، میرے عشق کا مطالبہ اور میری زندگی کا منتہیٰ ہے۔

اس میں میری کامیابی کچھ کم کامیابی نہیں۔ لیکن یہ تنہا میری کامیابی نہیں، آپ تمام احباب کی کامیابی ہے کہ اگر مجھے آپ کی رفاقت میسر نہ آتی تو میں تنہا اس طول طویل راستے کو بمشکل طے کر سکتا۔ الحمد للہ علیٰ ذالک۔ اور جب میں دیکھتا ہوں کہ اس دور میں جب کسی تحریک کی کامیابی کے لئے بڑے وسیع پیمانے پر اسباب و ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں یہ کامیابیاں اس بے سروسامانی کی حالت میں نصیب ہو رہی ہیں، تو میرا سرِ نیاز بارگاہِ مسبب الاسباب میں اور بھی زیادہ خشوع و خضوع سے جھک جاتا ہے۔

یہاں مذہب کے نام پر لوگوں نے جاگیریں کھڑی کر لیں۔ میدانِ سیاست میں گئے تو محلات استوار کر لئے۔ جاہ و منصب کی آماجگاہوں میں پہنچے تو اقتدار و اختیار کے جھولے جھلائے۔ آپ چاہتے تو آپ کو بھی یہ کچھ میسر آ سکتا تھا۔ لیکن آپ نے ان کی طرف نگاہِ غلط انداز سے بھی نہ دیکھا۔ نتیجہ یہ کہ آپ جس قسم کے فقیر بے نوا پہلے تھے اسی قسم کے بوریہ نشین آج ہیں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کو وہ دولتِ استغنا نصیب ہے کہ آپ ان میں سے بڑے سے بڑے صاحبِ ثروت و حشمت کو پورے قلندرانہ انداز سے کہہ سکتے ہیں کہ ؎

تیرے فرقِ ناز پہ تاج ہے، میرے دوشِ غم پہ گلیم ہے

تیری داستاں بھی عظیم ہے، میری داستاں بھی عظیم ہے

بلکہ میری داستان تم سے عظیم تر ہے کہ میری داستان قرطاسِ زمانہ پر سورج کی کرنوں سے ثبت ہو گی اور تمہاری داستان ریگِ ساحل پر ابھر آنے والے نقوش سے زیادہ کچھ نہ ہو گی جسے حوادثِ زمانہ کی ایک موج مٹا کر رکھ دیتی ہے۔

لیکن عزیزانِ من! اس مقام پر میں ایک انتباہ نہایت ضروری سمجھتا ہوں۔ اگر آپ کو آثارِ منزل زیادہ قریب نظر آ رہے ہیں تو وہ آپ کی رفتار میں تیزی کے متقاضی ہیں۔ یہاں پر کامیابی پہلے سے زیادہ گرمیٔ عمل کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس لئے آپ کو اپنی مساعی میں اور اضافہ کرنا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہ سفر کی اس آخری منزل میں مخالفت کی شدت اور بھی بڑھ جائے کہ رقصِ بسمل طبعاً انتہا پسند

ہوتا ہے۔ ان کامیابیوں نے میری عمر میں بے شک اضافہ کر دیا ہے لیکن میری توانائیوں میں اضافہ تو آپ کی رفاقت ہی سے ہو سکتا ہے۔ لہذا میں اس خطاب کا خاتمہ اس استدعا کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں کہ ؎

سفر کڑا ہے بہت کھل کے مسکراتے رہو — میرے ندیم! میرا حوصلہ بڑھاتے رہو
مناؤ جشنِ طرب ہاؤ ہُو ہیں "پیو" ! — تم اور زور سے کچھ تالیاں بجاتے رہو
اس ایک رشتے پہ سارا لگاؤ ہے قائم — وہ روٹھتا رہے اور تم اسے مناتے رہو
وہ اپنا کام کرے گا تم اپنا کام کرو — وہ چاہے آئے نہ آئے پہ تم بلاتے رہو

تم بلاتے رہو گے تو وہ آکر رہے گا کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (۶۰/۴۰) اس کا وعدہ ہے۔

ایفائے عہد

اور اب آخر میں ایفائے عہد۔

سابقہ کنونشن میں جب میں نے آپ احباب کی خدمت میں "شاہکارِ رسالتؐ" کا تحفہ پیش کیا تھا تو آپ کے تقاضا پا یوں کہئے کہ یاد دہانی پر میں نے وعدہ کیا تھا کہ آئندہ کنونشن پر بتوفیقِ ایزدی میں اس قرض کو بھی چکا دوں گا جو ایک عرصہ سے میرے ذمہ چلا آ رہا ہے۔ یعنی نظریۂ ختمِ نبوت کی عظمت و اہمیت اور اس کے خلاف تحریکِ "احمدیت" کی سازش سے متعلق کتاب — کتاب نہیں، میرے قلب کی گہرائیوں میں تڑپنے والا وہ جذبۂ پُرسوز جس کے متعلق اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

مرے گلو میں ہے اک نغمہ جبرئیل آشوب — سنبھال کر جسے رکھا ہے لامکاں کے لئے

میں نے اس کتاب کی ترتیب و تسوید کنونشن کے بعد ہی شروع کر دی تھی اور گزشتہ اپریل میں اس کا مسودہ مکمل ہو گیا تھا۔ جی میں تھا کہ میں اپنے عشق کی اس یادگار کو اپنے ذوق کے مطابق نہایت حسن و زیبائی سے طبع کراؤں اور اس تحفۂ درویش کو کنونشن کی تقریب پر آپ احباب کی خدمت میں پیش کروں گا کہ اتنے میں ربوہ کا حادثہ پیش آگیا اور ختمِ نبوت کے مسئلہ نے ہنگامی اہمیت حاصل کر لی۔ اس پر چاروں طرف سے تقاضے موصول ہونے لگ گئے کہ اس کتاب کو بلا تاخیر شائع کر دیا جائے۔ میں نے خود بھی اس کی اہمیت محسوس کی اور نہایت عجلت سے اس کی کتابت مکمل کرائی اور جون کے آخر میں کاپیاں پریس میں بھیج دی گئیں۔ (اتنے قلیل عرصہ میں کاپیوں کی تکمیل کے سلسلہ میں علاوہ دیگر رفقاء محترم منشی محمد سعید صاحب خوشنویس کا بدل شکر گزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر یہ مرحلہ بایں حسن و خوبی کبھی طے نہ ہو سکتا۔)

ہم سب اس عجلت میں تھے لیکن فطرت خندہ زن کہ تم نے جو وعدہ اپنے احباب سے کر رکھا ہے اس کتاب کا کنونشن سے پہلے شائع ہو جانا اس کی خلاف ورزی ہو گی۔ چنانچہ شروع جولائی میں "احمدیت" کے خلاف لٹریچر شائع کرنے پر حکومت کی طرف سے پابندی عائد کر دی گئی اور اس کتاب کی طباعت وہیں رک گئی۔ ان پابندیوں میں بالاقساط توسیع ہوتی رہی اور اس طرح تین ماہ تک بیتابیٔ تمنا اور صبر طلبیٔ عشق کی یہ کشمکش جاری رہی۔ میرا دل دھڑکتا تھا کہ اگر یہ پابندیاں اسی طرح آگے بڑھتی گئیں تو میں شاید کنونشن پر بھی اپنا وعدہ پورا نہ کر سکوں گا۔ لیکن میرے خدا نے میری بیکسی کی شرم رکھ لی۔ پابندیاں اٹھ گئیں کتاب کنونشن سے پہلے چھپ کر تیار ہو گئی — لیجئے! وہ پیشِ خدمت ہے — بلّلہ الحمد کہ ٹھکانے لگی محنت میری۔ میں بحضور بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سرخرو ہو گیا ؎

ہے یہی میری نماز، ہے یہی میرا وضو — میری نواؤں میں ہے میرے جگر کا لہو
میرا نشیمن نہیں درگہِ میر و وزیر! — میرا نشیمن بھی تو، شاخِ نشیمن بھی تو!
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ! — تو ہی مری آرزو، تو ہی مری جستجو

اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ۔ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا۔ (۵۶/۳۳) والسلام

طلوعِ اسلام کنونشن ۱۹۷۴ء

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

زمین کے ہنگامے

محترم حسن عباس رضوی

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمین کے ہنگامے
بُری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

صاحبِ صدر، معزز حاضرین و حضرات! سلام ورحمت

خیر

جہاں تک قانونِ الٰہی کا تعلق ہے قرآن حکیم کی رو سے وہ بِیَدِکَ الْخَیْرُ تعمیری اور مبنی بر خیر ہے۔ اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس طرح کر دی کہ وَقِيلَ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا مَاذَا أَنزَلَ رَبُّكُمْ مومنین سے ان کے مخالفین سوال کرتے ہیں، ہمیں بتاؤ تو سہی کہ تمہارے رب نے تمہاری طرف کیا نازل کیا ہے۔ تو وہ اس کے جواب میں قَالُوا خَيْرًا (۱۶/۳۰) "کہتے ہیں خیر" اس کی وضاحت اس طرح کر دی گئی کہ فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ ۚ وَلَدَارُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ (۱۶/۳۰) اس دنیا میں بھی ہر قسم کی خوشگواریاں اور مستقبل کی زندگی میں بھی خوشگواریاں۔ لہٰذا ہر وہ عمل جس کا نتیجہ حال اور مستقبل (دنیا اور آخرت) کی خوشگواریاں ہوں خیر ہے۔

خیر و شر

جہاں تک کائنات اور انسان کی قوتوں کا تعلق ہے کوئی شے فی نفسہٖ نہ خیر ہے نہ شر۔ ہر چیز میں خیر کا پہلو بھی ہے اور شر کا بھی۔ یہ اس شے کا طریقِ استعمال ہے جو اس چیز کو خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ پانی سے مزرعِ حیات پھلتی پھولتی ہے یہ اس کا خیر کا پہلو ہے۔ لیکن جب یہ پانی اندازے سے بڑھ جاتا ہے تو تباہی کا باعث بنتا ہے۔ یہ اس کا شر کا پہلو ہے۔ ندی نالے جب اپنے ظرف کے مطابق بہتے ہیں تو وجۂ شادابیٔ حیات بنتے ہیں۔ یہ ان کا خیر کا پہلو ہے۔ لیکن جب یہ حدود و قیود کو توڑ کر سرکش ہو جاتے ہیں تو گرد و نواح کی آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ زندگی جان چھپاتی پھرتی ہے۔ یہ ان کا شر کا پہلو ہے۔ دریا اس وقت تک دریا کہلاتا ہے جب تک اس کا پانی ساحلوں میں پابند ہے۔ اگر یہ اُن ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو اُسے دریا نہیں بلکہ سیلاب کہتے ہیں۔ جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوگا۔ تاہم یہ حقیقت ہے کہ دریا اس وقت سرکشی اختیار کرتے ہیں جب ان کی روانگی اور گذرگاہوں کو صحیح اندازے کے مطابق پابندِ سواحل نہیں کیا جاتا۔ چین کا دریائے زرد ہر سال اپنی گذرگاہ تبدیل کرتا اور اطراف و اکناف میں تباہی مچا دیتا تھا۔ ملک کو ہر سال ایک نئی قیامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ لیکن اب اس سرکش دریا کو اسی طرح قانون کی زنجیروں میں جکڑ دیا گیا ہے کہ کیا

مجال جو وہ اپنی گزرگاہ اور رُخ بدلنے کا ارادہ بھی کرے۔ وہ اسباب ہی ختم کر دئیے گئے ہیں جو اسے سرکشی پر آمادہ کرتے تھے۔

تسخیر اشیاء

دریا اپنی روانی کی خاصیت ورثہ کے طور پر اس مقام سے حاصل کرتا ہے جہاں سے وہ نکلتا ہے۔ اس کی روانی کا انحصار اس کی گزرگاہ پر ہے۔ جیسی گزرگاہ ہوگی ویسے ہی دریا کی روانی ہوگی۔ لیکن اگر کوئی قاعدے اور قانون کے مطابق گزرگاہ نہ ہو تو دریا جب سیلاب کی صورت اختیار کرتا ہے تو پانی گرد و نواح میں پھیل جاتا ہے اور راستے میں آنے والی ہر شے کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ لیکن اگر دریا کی گزرگاہ کو کسی قاعدے اور قانون کی رُو سے پابند کر دیا جائے تو سیلاب خواہ کتنی ہی شدت کا کیوں نہ ہو اپنی روانی کو حدود کے اندر محدود رکھتا ہے یا جو متبادل انتظامات کئے جاتے ہیں ان کے اندر پابند رہتا ہے۔ نہیں بلکہ اس کی سرکشی کو ایسے سانچوں میں ڈھال دیا جاتا ہے جن سے انسان اپنی مرضی کے مطابق کام لیتا ہے۔ اس طرزِ عمل کو دریاؤں کا (TAMING) اور (HARNESSING) کہا جاتا ہے۔ اس طرح جب دریاؤں کی روانیاں اور طغیانیاں انسان کے حیطۂ اختیار میں آجاتی ہیں تو اس مقام پر صداقت ہے۔ سَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ (۱۴/۳۲) "اس طرح ہم نے تمہارے لئے دریا بھی مسخر کر دئیے"۔

ورثہ اور ماحول

اب آگے بڑھئے اور انسانی دنیا میں آجائیے۔ انسانی بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو وہ انسانی کیفیت اور ماہیت اور نشو و نما کے میلانات اپنے ماں باپ سے ورثہ میں لے کر پیدا ہوتا ہے، جسے (HEREDITY) کہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسانی بچہ ورثہ کی وجہ سے انسان بنتا ہے اور دوسری اقسام و انواع ——— (SPECIES) سے علیحدہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انسانی بچہ اس خدا کی طرف سے پیدائشی اعتبار سے مضمر صلاحیتیں (POTENTIALITIES) — "LATENT POTENT اور DORMENT" شکل کے اندر ودیعت کر دی گئی ہے۔ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا (۹۱/۸) اور پھر انسان کے اندر تعمیر و تخریب دونوں کی صلاحیت بھی ودیعت کر کے رکھ دی گئی ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو انسانی بچہ کو دیگر حیوانی بچوں سے متمیز کرتی ہیں۔

انسانی جسم اور صلاحیتوں کی نشو و نما

جہاں تک انسان کی حیوانی سطح کا تعلق ہے۔ اس کی نشو و نما (MATURATION) (پختگی) سے ہوتی ہے جو "PHYSICAL-LAWS" کے تابع ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسانی بچے کی مضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کا انحصار اس ماحول یعنی (ENVIRONMENT) پر ہوتا ہے جسے انسانی بچہ یا تو از خود اختیار کرتا ہے یا اسے میسر آتا ہے۔

دریا کی گزرگاہ اور انسان کے ماحول کی مثال

اب ذرا پیچھے چلئے اور دریا کی مثال کو سامنے لائیے۔ دریا جس مقام سے نکلتا ہے وہاں سے روانی کی تعمیری اور تخریبی صلاحیتیں لے کر نکلتا ہے۔ جس طرح انسانی بچہ کے اندر فجور و تقویٰ کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ دریا کے تعمیری اور تخریبی کردار کا انحصار گزرگاہ کی کیفیت پر ہوتا ہے۔ جیسی گزرگاہ ہوگی ویسا ہی دریا کا کردار ہوگا۔ پانی کی دنیا میں اسی گزرگاہ کی مثال انسانی دنیا کے (ENVIRONMENT) کی مثال ہے۔ انسانی دنیا کا ماحول ——— (ENVIRONMENT) بھی ایک گزرگاہ ہے۔ جس طرح دریا اس وقت تک دریا رہتا ہے جب تک اس کا پانی ساحلوں میں پابند رہتا ہے۔ اسی طرح انسان اس وقت تک انسان کہلا سکتا ہے جب تک وہ قوانینِ خداوندی کے ساحلوں میں محصور رہتا ہے۔ جس طرح دریا ساحلوں کو توڑ کر حدود فراموش ہو جائے تو وہ دریا نہیں رہتا بلکہ سیلاب کہلاتا ہے،

جس کا نتیجہ تخریب ہی تخریب ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر انسان قوانین خداوندی کے مقرر کردہ حدود وقیود یعنی ساحلوں کو توڑ کر سرکش و بے باک ہو جائے تو انسان انسان نہیں رہتا بلکہ حیوان نظر آتا ہے۔ یوں کہئے کہ شیطان بن جاتا ہے جس سے معاشرے کے اندر تباہی و بربادی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔

آج کا طالب علم

آجکل ہمارے نوجوان طبقہ خاص کر طالب علموں کے اندر ساحل فراموشی اور سرکشی اس حد تک بڑھ گئی ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں گذرتا، جب توڑ پھوڑ، آتش زنی، پتھراؤ، خون خرابہ، ہڑتال، ناکہ بندی اور تالہ بندی کے واقعات رونما نہ ہوتے ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ نظم ونسق درہم برہم ہو کر رہ گیا ہے۔ کوئی شخص بھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھتا۔ اس بربریت کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے انسان نے انسان کو کھو دیا ہے

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اور اکبر کے الفاظ ہیں ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی!

لیکن یہ سب کچھ اس نظامِ تعلیم کی بدولت ہے جسے ہم نے پاکستان بننے کے ساتھ انگریز سے ورثہ میں پایا تھا اور یہ وہ نظامِ تعلیم ہے جس نے خود یورپ کے نوجوان طبقہ کی کیفیت ایسی بنا دی ہے جس پر ایک مغربی مفکر جوڈ یوں مرثیہ خواں ہے۔

> ہمارا نوجوان طبقہ شاہراہِ زندگی پر بلا تعینِ مقصد چلا جا رہا ہے۔ انہیں کچھ علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں بلکہ یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم چل ہی کیوں رہے ہیں۔ نہ ان کے سامنے کوئی ضابطۂ زندگی ہے، نہ آئینِ حیات ہے، نہ اقدار ہیں، نہ معیار۔

یہ تو تھا جو کچھ یورپ کے نوجوانوں کے ساتھ ہوا۔ لیکن جو کچھ ہمارے نوجوانوں پر گذری ہے وہ ایک عظیم المیہ ہے۔ ہم اس نظامِ تعلیم کو اپنا اوڑھنا، بچھونا بنائے ہوئے ہیں۔ جس سے خود اس کے وضع کرنے والے بھی تائب نظر آتے ہیں۔ جس چیز کو وہ اپنے زوال کا سبب قرار دیتے ہیں ہم اسے اپنے کمال کا زینہ سمجھتے ہیں۔

سیاسی جماعتوں کا کردار

اگرچہ بنیادی طور پر یہ سب کچھ غلط طرزِ تعلیم کا نتیجہ ہے تاہم عصرِ حاضر میں اس کی بیشتر ذمہ داری ان سیاسی جماعتوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے حصولِ مقصد کی خاطر طالب علموں کو آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ یہ سیاسی بازی گر اس حقیقت کو فراموش کر بیٹھے ہیں کہ قوموں کی کامیابی اور کامرانی کا انحصار نوجوانانِ ملّت کی سیرت پر ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھتے کہ اگر ملک و ملّت کی یہ متاع اس طرح لٹتی رہی تو کل کو ملک کی باگ ڈور کون سنبھالے گا۔

ہماری کوتاہ بینی

برادرانِ عزیز! یہ بچے ایسے نہ تھے، جیسے اب نظر آ رہے ہیں۔ ہمیں ان سے کوئی شکوہ نہیں۔ لیکن ؎

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

ان سے کہیں بڑھ کر قصور ہمارا ہے۔ ہم ہی نے ان کی گزرگاہوں کو صحیح ساحل مہیا نہ کئے۔ جن کے اندر ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا رخ صحیح سمت کی طرف ہوتا ـــــ اور ان کی تعمیری صلاحیت "تَقْوٰىهَا" ان کی تخریبی قوت "فُجُوْرَهَا" پر غلبہ حاصل کر لیتی۔ اس کوتاہی کا نتیجہ اپنی تباہی اور بربادی کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ جس کے لئے خدا کے حضور

ہمیں جوابدہ ہونا پڑے گا۔

طلوعِ اسلام کا مخاطب

سامعین کرام! یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نوجوانوں کا طبقہ کسی ملک اور قوم کا طغرہ (CRAST) ہوتا ہے جس سے قوم پہچانی جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ قوموں کی تقدیر ہمیشہ ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی صلاحیتیں ان کے گرم خون کی حرارتیں، ان کا زورِ بازو، ان کا جوشِ کردار ایک کف بداماں سیلاب کی طرح اٹھتا ہے اور ہر ٹکرانے والی قوت کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے جاتا ہے۔ قوموں کی تخلیق ان کے نوجوانوں کے کوہ شکن ارادوں کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ اس لئے یہی طبقہ تھا جسے طلوعِ اسلام نے اپنے تصورات کی آماجگاہ، اپنی امیدوں کا مرکز، اپنی تمناؤں کا محور اور قوم کے مستقبل کا مظہر قرار دیا۔ اور اسی کو اپنے پیغاماتِ انقلاب آفریں کا درخورِ تخاطب سمجھا۔ اور انہی کے لئے عہدِ حاضر کے مفکر پرویز صاحب اقبال ہی کے الفاظ میں دعا مانگتے ہیں کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے ۔۔۔ پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا آرزو میری یہی ہے ۔۔۔ مرا نورِ بصیرت عام کر دے

مثالی درس گاہ

طلوعِ اسلام پاکستان کے اندر پچھلے ستائیس برس سے مسلسل مرض کی نشاندہی کرتا چلا آرہا ہے کہ ان بیماروں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ کیونکہ آپ جس قسم کی قوم بنانا چاہیں اس کے بچوں کو اس قسم کی تعلیم دینی چاہیئے۔ تعلیم بدل جانے سے نگاہ کا زاویہ بدل جاتا ہے اور زاویۂ نگاہ بدلنے سے اشیاء کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ جب اقدار بدل جائیں تو دنیا کچھ کی کچھ ہو جاتی ہے۔ ایسی تعلیم کے لئے طلوعِ اسلام نے یہ حل پیش کیا کہ پاکستان کے اندر ایسی درسگاہیں قائم کی جائیں جن کی تعلیم کا محور خدا کی کتاب یعنی قرآنِ حکیم ہو اور یہ درسگاہیں ایسے طالب علم تیار کریں کہ:

۱۔ پاکستان میں وقتاً فوقتاً جو مسائل سامنے آئیں وہ بتا سکیں کہ اس باب میں قرآن کیا راہنمائی دیتا ہے۔

۲۔ اسلامی مملکت کا آئین کیسا ہونا چاہیئے اور قوانین کس قسم کے۔

۳۔ افراد کی زندگی اسلامی قالب میں کس طرح ڈھل سکتی ہے اور معاشرہ قرآنی خطوط پر کس طرح متشکل ہو سکتا ہے۔

۴۔ وہ کونسی ایسی عملی کسوٹی ہے جس سے ہر وقت معلوم کیا جا سکے کہ قوم صحیح راستے پر چل رہی ہے یا اس کا کوئی قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے۔

۵۔ دُنیا کی مختلف قومیں اس وقت جن معاشی، معاشرتی، سیاسی، قومی، بین الاقوامی مسائل سے دوچار ہیں اور جن کا کوئی اطمینان بخش حل انہیں نہیں ملتا جس کی وجہ سے امنِ عالم سخت خطرے میں پڑ رہا ہے قرآنِ حکیم ان مسائل کا حل کیا تجویز کرتا ہے۔

۶۔ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل طالب علم ایسی قابلیت کے مالک ہوں کہ وہ دنیا کے بڑے بڑے اجتماعات میں قرآنی نکتۂ نگاہ نہایت وضاحت سے پیش کر سکیں اور اپنے ملک میں

بھی دوسروں کی رہنمائی کر سکیں۔

۷۔ ذہنی قابلیت کے علاوہ ان کا کیریکٹر بھی اتنا بلند ہونا چاہئے کہ وہ دوسرے نوجوانوں کے لئے قابلِ تقلید مثال پیش کر سکیں اور اس طرح اس حقیقت کی زندہ شہادت بن سکیں کہ جب انسانی قلب و دماغ قرآن کے قالب کے اندر ڈھل جائیں اور وہ سیرتِ نبی اکرمؐ کو اپنے سامنے بطور اسوۂ حسنہ رکھ لیں تو اس سے کس طرح ایسے انسان پیدا ہوتے ہیں جن پر انسانیت فخر کر سکے۔

ایک ممتاز قانون دان کا طلوعِ اسلام کو خراج

برادرانِ عزیز: طلوعِ اسلام نے جو فکر پیش کی ہے اس کے متعلق پاکستان کے ممتاز قانون دان اور سابق وحدتِ مغربی پاکستان کے چیف جسٹس جناب اے۔ آر۔ کیانی (مرحوم) نے سنہ ۱۹۶۱ء کے زرعی یونیورسٹی لائل پور کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر فرمایا:

تعلیمی درس گاہوں کے پیشِ نظر یہی نہیں ہونا چاہئے کہ طالب علم ایک معینہ مدت کے بعد صرف اسناد ہی لے کر فارغ ہوں بلکہ وہ اسناد کے ساتھ ان درس گاہوں سے انسان بن کر بھی نکلیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طلبا ان درسگاہوں سے انسان بن کر نکلیں، تو ان درسگاہوں کے اندر آپ کو لامحالہ اس فکر کو اپنانا ہوگا جو طلوعِ اسلام نے پیش کی ہے۔

حرفِ آخر

برادرانِ عزیز! طلوعِ اسلام اب بھی مایوس نہیں۔ وہ اپنے نوجوانوں میں زندگی کی جھلک اب بھی دیکھتا ہے۔

اقبالؒ کے الفاظ ہیں ؎

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشتِ ویراں سے ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

طلوعِ اسلام کہتا ہے کہ ملت کی کشتِ ویراں کا نم اُس آبِ نشاط انگیز سے حاصل ہوتا ہے جسے قرآن کہتے ہیں۔ قرآن کے مقرر کردہ حدود و قیود ہی وہ پختہ ساحل ہیں جو حیاتِ انسانی کی جوئے رواں کا رُخ متعین کرتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے اندر یہ انقلاب صحیح تعلیم کی رو سے لایا جا سکتا ہے۔ اس لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ ان بچوں کی صحیح تعلیم کا بندوبست کر دیا جائے۔ ان کی گزرگاہوں کو وہ ساحل مہیا کر دئے جائیں جن کی بنیاد ان قوانین پر ہو جو قرآن حکیم کی دفتیں میں موجود ہے۔ جنہیں کہیں باہر سے IMPORT کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہی وہ واحد طریقہ ہے جس سے ملک و قوم کی یہ عظیم متاع محفوظ ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو مجوزہ تعلیمی درسگاہیں ایسی درس گاہیں بن جائیں گی جو ان درس گاہوں سے مختلف ہوں گی۔ جن کے متعلق اکبرؔ نے کہا تھا۔ ؏

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

والسلام

ہندو کے عزائم

"کسی بھارتی نے تقسیمِ ہند کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اور نہ کبھی تسلیم کرے گا"

(بھارت پارلیمنٹ کے ممبر مسٹر سبرامنیم سوامی "پاکستان کے خلاف جنگ کی تیاریوں کے سلسلہ میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔ مجلہ آرگنائزر دہلی کے ۱۳ جولائی ۱۹۷۷ء کے شمارہ میں ان کا ایک مقالہ شائع ہوا جسے دیگر اخبارات نے بھی نقل کیا۔ ذیل میں ہم اس مقالہ کا اُردو ترجمہ (معاصر چٹان کے شکریہ کے ساتھ) بلا تبصرہ شائع کرتے ہیں۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ پاکستان کے متعلق ہندو کے عزائم کیا ہیں۔)

کئی سال پہلے کی بات ہے کہ کچھ لوگ مجھے "بم سوامی" کے نام سے پکارتے اور یہ مذاق اڑاتے تھے، لیکن آج جب یہ بم پھٹ چکا ہے، مجھے ایک حد تک ان لوگوں سے نفرت سی محسوس ہو رہی ہے۔ کیونکہ میں نے انہیں بڑی ڈھٹائی سے بھارت کے ایٹمی دھماکہ کی تعریف کرتے سنا ہے، گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ پوکران کا ایٹمی تجربہ پُرامن مقاصد کے لئے ہے اور ایٹمی ہتھیار نہیں بنائے جائیں گے۔ لیکن پھر بھی بھارت کے اندر اور باہر لوگوں کی ایک کثیر تعداد آج بھی یہ سوال کرتی ہے کہ آخر اندرا گاندھی اس پر کیسے رضامند ہوئی؟ ایک وجہ بظاہر یہ نظر آتی ہے کہ اندرا گاندھی نے یہ سب کچھ اپنی مقبولیت کے لئے کیا ہے، ہو کرسی سرکھشا" کے لئے یعنی اپنے اقتدار کے لئے کیا ہے، اور اس سلسلے میں وہ ہر ایسا کام کر سکتی ہیں، جس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت میں قوم پرست طاقتیں مضبوط ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہہ لیجئے کہ اگر اندرا گاندھی ناکام ہوئیں تو قوم پرست برسرِ اقتدار آئیں گے اور وہ اپنی حسبِ منشا پروگرام کو مکمل کریں گے، لیکن اگر اندرا گاندھی بدستور حکمران رہتی ہیں تو صرف اسی صورت میں، کہ وہ ان کے پروگرام کو جسے جن سنگھ نے ایجی ٹیشنوں اور مظاہروں کے ذریعہ مقبول بنا دیا ہے، عملی جامہ پہنا کر اپنی مقبولیت میں اضافہ کریں، اگرچہ اس حقیقت کو بظاہر کتنی پیچیدگیوں میں الجھا دیا گیا ہے، لیکن موجودہ صورتِ حال کا جوہرِ اصلی اس کے سوا کچھ نہیں۔

بنگلہ دیش ڈرامہ

۱۹۷۱ء سے بھارتی حکومت کے زیادہ تر اور اہم فیصلے قوم پرست املا کرواتے ہیں۔ پہلا فیصلہ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے اور بنگلہ دیش قائم کرنے کا تھا۔ ہر باخبر شخص جانتا ہے کہ اندرا گاندھی بھارتی افواج کو بنگلہ دیش بھیجنے کی سخت مخالف تھیں۔ حتیٰ کہ نومبر ۱۹۷۱ء میں جب بھارتی وزیر اعظم نے صدر نکسن سے ملاقات کی، اس وقت تک ان کو یہی توقع تھی کہ امریکہ "پناہ گزینوں کا مسئلہ" ایک پاکستان

کے ڈھانچہ کے اندر حل کر سکتا ہے۔ اگر صدر نکسن شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ اپنی بات چیت کا ٹیپ جاری کر سکیں تو میرے اس مؤقف کی تائید ہو سکتی ہے۔ تاہم اس کے علاوہ بھی بعض شہادتیں اس کی تصدیق کرتی ہیں ــــ سردار سورن سنگھ اقوام متحدہ سے اس مؤقف کے ساتھ واپس آئے کہ ــــ "مسئلہ کو ایک پاکستان کے ڈھانچہ ہی میں" حل کیا جائے۔

اکتوبر میں الجزائر اور روس کا جو مشترکہ اعلامیہ جاری ہوا، اس میں بھی اسی امر کی سفارش کی گئی تھی۔ گویا "ایک پاکستان" کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی پالیسی کا کوئی وجود نہ تھا، البتہ قوم پرست اور جن سنگھی اپنی کوششوں میں مصروف تھے۔

جن سنگھ نے اگست ۱۹۷۱ء میں زبردست عوامی مظاہروں کے ذریعہ ہلا کر رکھ دیا اور چونکہ ۱۹۷۲ء میں انتخابات ہونے والے تھے، اس لئے اندرا گاندھی "کرسی سرکھشا" کے لئے اپنی پالیسی ترک کرنے اور جنگ چھیڑنے پر مجبور ہو گئیں۔ ایک غیر جانبدار تجزیہ بتاتا ہے کہ بھارت نے "تارکینِ وطن کا مسئلہ حل کرنے کے لئے پاکستان کو دو نیم نہیں کیا۔ ایسا سوچنا زیادتی ہے۔ بھارت نے یہ جنگ محض قوم پرستوں کی تسلی اور نتیجتاً اس مقبول عام نظریہ کی تشفی کے لئے چھیڑی تھی کہ پاکستان کا ٹکڑے ہونا بھارت کے طویل المیعاد اور دوررس مفاد میں ہے۔

بھارتی وزیرِ اعظم بنگلہ دیش کو آزادی دلانے والی عظیم شخصیت بن سکتی تھیں، لیکن دو اسباب کی بنا پر ان کے پاؤں اکھڑ کر رہ گئے۔ اولاً یہ کہ جب انہوں نے ساتویں فلیٹ کے خلیج بنگالہ میں داخل ہونے کی خبر سنی، ان کا فوری ردِ عمل یہ تھا کہ بھارتی افواج اپنا سب کچھ سمیٹ سینت کر واپس آجائیں۔ (اس ضمن میں ہمیں ان کے باپ نہرو کے اس ردِ عمل کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے جو آسام کی سرحدوں پر چینی یلغار سے ہوا تھا) ــــ دوسرے وہ رات گئے روسی سفیر ویسلی کزنیتشوف سے تبادلۂ خیال اور اس کی یقین دہانی حاصل کرنے کے لئے صفدر جنگ روڈ سے روسی سفارت خانہ پہنچیں۔ بہرحال قوم پرست اپنا بنیادی مطالبہ تسلیم کروانے میں کامیاب ہو گئے، اگرچہ ان کی خواہشات اور ضروریات بہت زیادہ تھیں۔

حالیہ واقعہ ایٹمی دھماکہ کا ہے۔ یہ بم یا ہتھیار جس کا پوکران میں تجربہ کیا گیا ہے، ایٹم بم سے کہیں زیادہ جدید اور مہلک ہے۔ ایٹم بم میں تابکاری اثرات کو قوی بنانے کی کوشش کی جاتی ہے جو کہ آسان ہے، جبکہ زیرِ زمین تجربہ میں، تابکاری اثرات کو سمیٹنے اور کم سے کم کرنے کی کوشش ہوتی ہے جو ایک مشکل امر ہے۔ مزید برآں ایٹمی ذرات کو پھاڑنے کے تکنیکی عمل نے ہمیں ہائیڈروجن بم کی ایجاد کی دہلیز پر پہنچا دیا ہے جو ہم اس وقت ایجاد کریں گے جب تھوریم کا دور شروع ہوگا۔ پوکران تجربہ کے بارے میں کسی کو شکایت نہیں ہونی چاہئے کیونکہ یہ مقررہ انداز میں کیا گیا ہے۔ البتہ اس کے نتیجہ میں امداد دینے والے ملک سے جس طرح احتجاج ہوا ہے وہ مایوس کن اور ایک ایٹمی طاقت کے لئے غیر مفید ہے، لیکن ایک ایسے ہمسایہ سے اس کے سوا کیا توقع کی جا سکتی ہے جسے امداد میں تخفیف کے خطرے کا سامنا ہو۔

جناب بھٹو مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے بھارت کے ایٹمی تجربہ میں پوشیدہ خطرہ کو پوری طرح بھانپ لیا ہے۔ بلاشبہ پوکران کا تجربہ پاکستان کے لئے ایک سنگین خطرے کا سگنل ہے۔ شریمتی اندرا گاندھی اور سردار سورن سنگھ جتنی بھی یقین دہانیاں کرائیں، وہ اس وقت تک زبانی جمع خرچ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتیں جب تک قوم پرست طاقتیں ان کی توثیق و تصدیق نہ کریں۔ لیکن بھارتی قوم پرست بچے کھچے پاکستان کے بھی درپے ہیں اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کی فکر میں ہیں کہ یہی اکھنڈ بھارت کا راستہ ہے۔

کسی بھارتی نے تقسیم ہند کو کبھی بھی تسلیم نہیں کیا اور نہ کبھی کرے گا۔ تقسیم استعمار کا ایک پُر فریب کھیل تھا جو اس نے کانگرس کی ہوس اقتدار کی آڑ میں کھیلا تھا۔ قوم پرست مستقبل قریب میں برسر اقتدار آئیں یا نہ۔ بہر حال ان کے سریر آرائے سلطنت ہونے کا عمل تھر کے ریگزار میں ایٹمی دھماکہ سے شروع ہو چکا ہے۔ اب یہ ہر قوم پرست کا فرض ہے کہ وہ بھارتی عوام کی خفتہ امنگوں کو بیدار کرے، تاکہ اگر مستقبل قریب میں کوئی موقع پیدا ہو تو اندرا گاندھی کی کرسی سرکشا یا ہوس اقتدار کی خواہش کو اپنی مرضی کے لئے استعمال کر سکیں۔

اندرا گاندھی ایسی خاتون ہیں جو اپنے اقتدار کو برقرار رکھنے کے لئے انتہائی "ناپسندیدہ" پالیسی کو بھی اپنا لیں گی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ڈیگال کی مداح ہیں۔ لیکن ڈیگال فرانسیسی فرانک کی قیمت میں کمی کرنے کے بجائے اقتدار سے دستبردار ہو گئے تھے۔ مگر اس کے برعکس شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے دورِ اقتدار کا آغاز بھارتی روپے کی قیمت میں کمی سے کیا ہے اور تب سے اب تک انتہائی خاموشی سے بھارتی روپے کی قیمت میں تین بار کمی کر چکی ہیں۔

یہ ہیں وہ حالات جن میں شری بھٹو انتہائی خطرہ محسوس کرتے ہیں، لیکن وہ کیا کریں؛ چین ان کی زیادہ مدد نہیں کر سکتا، صرف پندرہ ہزار سپاہی سرحد پر بھیج کر چین کی مواصلاتی لائن کو برقرار رکھنے کے لئے چین کو تبت میں نوّے ہزار جوانوں کی ضرورت ہوگی، وہ کوئی مؤثر کارروائی نہیں کر سکیگا، اور اگر چین پاکستان کے لئے مداخلت بھی کرے، جب تک وہ بھارتی افواج کو چین ہند سرحدوں سے بیس کلو میٹر پیچھے دھکیلے گا، ہماری افواج پاکستان میں اپنا کام مکمل کر چکی ہوں اور ہم اپنی افواج کو دوبارہ چینی سرحدوں پر بھیج سکیں گے۔ یہ طریقِ کار چینی حملہ کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتا ہے۔

شری بھٹو کے سامنے کوئی راستہ نہیں، وہ زیادہ سے زیادہ کچھ عرصہ کے لئے وقت کو ٹال سکتے ہیں۔ پاکستان میں پہلے ہی دراڑیں پیدا ہو چکی ہیں۔ وہ دن دور نہیں جب پختونستان، سندھو دیش اور بلوچستان کی تشکیل و قیام کے لئے دباؤ بڑھ جائے گا۔ ہم بھارتیوں کو نفسیاتی طور پر اس کے لئے تیار رہنا چاہیئے اور اسوقت اپنی فوجیں پاکستان میں داخل کر دینی چاہئیں کہ پختونستان، سندھو دیش اور بلوچستان کے سربراہ ہمارے متلاشی ہوں گے۔

ہمارے ملک میں بعض عناصر بلاشبہ تقسیم کو ختم کرنے کے اقدام کو ناقابلِ تحسین قرار دیتے ہیں، لیکن شری بھٹو کو ایسے عناصر کے دھوکے میں نہیں چاہیئے۔ انہی عناصر نے بھارت کے ایٹمی قوت بن جانے کے تصور کا مذاق اڑایا ہے۔ آزاد بنگلہ دیش کی سوچ کا مذاق اڑاتے رہے ہیں اور غلہ کی تھوک تجارت کا، ڈی نیشنلائزیشن کے مطالبہ سے استہزاد کیا ہے۔ لیکن کیا وہ وقت کی رفتار کو روک سکتے ہیں، ہرگز نہیں —— بھارت کی اکثریت تقسیم کو ختم کرنا چاہتی ہے اور وقت ہمیں اکھنڈ بھارت کی راہ پر لے جا رہا ہے۔ ہمیں خود کو اس کے لئے تیار رکھنا چاہیئے۔

استدراک

جہاں تک بھارتی دھماکے کے بجائے جنگ خطرہ کا تعلق ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہ ہمارے لئے خطرہ ہے اور مہیب خطرہ۔

جب بھارت نے ڈھنڈورا پیٹنا شروع کیا تھا کہ ایٹم بم پُرامن مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے گا تو اس وقت ہمارا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہ ایک اور قسم کی ہماری تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ایٹمی بم زمین میں ہل چلانے کے لئے تو استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہ پہاڑوں کی چٹانیں اڑانے کے کام آسکتا ہے۔ اب جو بھارت کا یہ منصوبہ سامنے آیا کہ وہ دریائے چناب

کے اس حصہ پر جو ان کے ملک میں پہاڑوں میں واقعہ ہے بجلی گھر کے لئے بند بنا رہے ہیں، تو وہ خطرہ مشہود ہو گیا۔ دریائے چناب ہمارے لئے وسیلۂ زندگی ہے۔ اگر بند بنا کر اس کا پانی بھی روک لیا گیا تو ہماری معیشت کا گلا گھٹ جائے گا۔

یہ ہے ان پُرامن مقاصد میں سے ایک مقصد جس کے لئے بھارت کا ایٹم بم استعمال کیا جائے گا۔

یاد رکھئے! بھارت کے مذموم عزائم کے تدارک کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں کہ ہم اپنی قوم کو مسلسل اور متواتر بتاتے رہیں کہ ہندو کیا ہے؛ اس کے عزائم کیا ہیں؛ وہ کس طرح ہمارے مٹانے کے درپے ہے؛ بھارت کے ساتھ عندالضرورت مذاکرات کیجئے، لیکن قوم کے دل سے اس حقیقت کو ایک ثانیہ کے لئے بھی اوجھل نہ ہونے دیجئے کہ ہندو ہمارا بدترین ازلی دشمن ہے اور اس حقیقت کو عام کرنے کے لئے قوم کے تمام ذرائع ابلاغ کو کام میں لائیے۔ یہ جو ہماری پالیسی ہے کہ ہندو کے خلاف نفرت و عداوت کے جذبات مت پھیلائیے کیونکہ اس سے اس کے ساتھ ہمارے تعلقات "کشیدہ" ہو جائیں گے۔ تو یہ غلط پالیسی ہے۔ ہندو کے ساتھ ہمارے تعلقات ہمیشہ ہمیشہ کشیدہ رہیں گے۔ ہم دوستانہ تعلقات کی لاکھ کوشش کریں ہندو ہمارا دوست کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہمیں اس خوش فہمی میں کبھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ نہ ہندو ہمارا دوست ہو سکتا ہے، نہ ہم اس کے دوست ہو سکتے ہیں۔ یہ قرآنی صداقت ہے جسے ہماری خوش فہمیاں کبھی جھٹلا نہیں سکتیں۔

محترم پرویز صاحب کا درسِ قرآن کریم

لاہور میں
ہر اتوار صبح ۸½ بجے
بمقام ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲۔ لاہور
ٹیلیفون:- ۸۰۸۰۰

لائلپور میں
بروز جمعہ (بذریعہ ٹیپ) ۵½ بجے سہ پہر
بمقام:- دفتر بزمِ طلوعِ اسلام
۹۵ کوتوالی روڈ، متصل حیات سرجری کلینک
رابطہ کے لئے — فون نمبر ۲۳۹۴

ملتان میں
بروز جمعہ
(بذریعہ ٹیپ) بعد نماز مغرب
بمقام دفتر شاہ سنز، بیرون پاک گیٹ
فون نمبر ۲۰۷۱ ملتان

سیالکوٹ میں
(بذریعہ ٹیپ)
ہر اتوار۔ صبح ۸½ بجے
مکان نمبر ۸۹/۴- چوہدری محمد دین ولد کمال دین
نمائندہ بزم طلوعِ اسلام
موضع و ڈاکخانہ گوہدپور (محلہ غربی) سیالکوٹ

کراچی میں
ہر اتوار۔ صبح ۹½ بجے۔ (بذریعہ ٹیپ)
بمقام دفتر بزمِ طلوعِ اسلام
دار القائمہ - ۲۰-۱-B - بس سٹاپ ۲، ناظم آباد ۳
کراچی ۱۸
فون نمبر (۶۱۰۶۶۸)

کوئٹہ میں
(بذریعہ ٹیپ)
ہر اتوار۔ ۳½ بجے بعد دوپہر
بمقام۔ ۲۸ گوردت سنگھ روڈ
فون نمبر ۷۰۲۳ کوئٹہ

راولپنڈی میں
(بذریعہ ٹیپ)
ہر جمعہ۔ ۵ بجے سہ پہر
بمقام۔ جی ۱۶۶ - لیاقت روڈ
راولپنڈی

واہ میں
ہر جمعہ
بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
بمقام ۱-۱۵- جہلم روڈ
واہ (WAH)

عبدالحمید صدیقی صاحب کی خدمت میں

سید ابوالاعلےٰ مودودی صاحب کے ماہنامہ "ترجمان القرآن" کے "اشارات" (افتتاحیہ) محترم عبدالحمید صدیقی صاحب لکھتے ہیں۔ انہوں نے اس ماہنامہ کی اکتوبر ۱۹۷۶ء کی اشاعت کے اشارات میں اپنے انداز میں اس نکتہ کی وضاحت کی ہے کہ حضور نبی اکرمؐ پر ایمان کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے پہلے لکھا ہے۔

> مسلمان ہونے کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ زبان سے اور دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت کا اعتراف کرے اور اس اعتراف کو اپنی زندگی کا سب سے بیش قیمت سرمایہ تصور کرے کہ خداوند تعالےٰ نے بنی نوع انسان کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے نبوت کا جو مقدس سلسلہ قائم کیا تھا، اُسے محمد الرسول اللہ کی ذاتِ گرامی پر ختم کر دیا گیا ہے۔ اب قیامت تک حضورؐ ہی انسانوں کے مطاع اور ہادی اور رہنما ہیں۔

اس شرطِ ایمان کے بعد آپ لکھتے ہیں۔

> حضورؐ پر ایمان کے سلسلہ میں بعض گمراہ طبقے بڑی عیاری کے ساتھ لوگوں کے اندر اس باطل خیال کو پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ حضورؐ بلاشبہ نبی برحق تھے اور ان کے عظیم الشان کارنامے بھی ہر لحاظ سے قابلِ ستائش ہیں لیکن حضورؐ کی نبوت اور حضورؐ کی تعلیمات کا تعلق چونکہ اس مخصوص دور سے تھا جس میں آپ مبعوث ہوئے، اس لئے ان کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد، یا زیادہ سے زیادہ ان کی وفات کے دس بارہ سال بعد، وہ دور ختم ہو گیا، لہٰذا حضورؐ کے ارشادات اور فرمودات اور ان کے پاکیزہ افعال و اعمال خواہ اس دور کے لئے کس قدر غیر معمولی اہمیت کے حامل رہے ہوں ہو، مگر آج کے دور میں وہ تمام کے تمام واجب الاتباع قرار نہیں دیئے جا سکتے ۔۔۔ آج عصری تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی صحت اور افادیت کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ ان عیار لوگوں کے الفاظ خواہ کتنے ہی دلفریب اور دلکش ہوں لیکن ان کے پیچھے صرف یہی جذبہ کام کرتا ہے کہ حضورؐ کی نبوت کو ایک عارضی اور وقتی رہنمائی سمجھ کر اُسے ایک قصۂ پارینہ بنا دیا جائے۔

صدیقی صاحب کے پیش کردہ اصول سے حسب ذیل نتائج مستنبط ہوتے ہیں۔

(۱) حضور نبی اکرمؐ کے جملہ ارشادات و فرمودات اور آپؐ کے پاکیزہ افعال و اعمال (تمام کے تمام) واجب الاتباع

ہیں۔ ان میں کسی قسم کی بھی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ اگر کوئی شخص ان میں سے بعض کو واجب الاتباع تسلیم کرے اور بعض کو ایسا تسلیم نہ کرے تو وہ رسول اللہ پر ایمان کی دولت سے محروم سمجھا جائے گا۔ اور

(۲) حضورؐ کے جملہ ارشادات و فرمودات اور ان کے پاکیزہ افعال و اعمال قیامت تک کے لئے واجب الاتباع ہیں۔ ان میں سے نہ کسی کو کسی زمانے میں ترک کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا تغیر و تبدل جائز ہے۔ جو شخص ایسا سمجھے، رسالتِ محمدیہ پر اس کا ایمان باقی نہیں رہے گا۔

ان اصولات کی روشنی میں ہم محترم صدیقی صاحب سے کچھ سوال پوچھنا چاہتے ہیں۔ ایک شخص کا عقیدہ یہ ہے کہ ارشادات و فرمودات نبویؐ، یعنی سنت رسول اللہ بے شک واجب الاتباع ہے۔ لیکن:

> سنت اُس طریقِ عمل کو کہتے ہیں جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس سے شخصی زندگی کے وہ تمام طریقے خارج ہیں جو نبیؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کئے۔ یہ دونوں چیزیں کبھی ایک ہی عمل میں مخلوط ہوتی ہیں اور ایسی صورت میں یہ فرق و امتیاز کرنا کہ اس عمل کا کون سا جزو سنت ہے اور کونسا جزو عادت، بغیر اس کے ممکن نہیں ہوتا کہ آدمی اچھی طرح دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہو ۔۔۔۔ تمدن و معاشرت کے معاملات میں ایک چیز وہ اخلاقی اصول ہیں جن کو زندگی میں جاری کرنے کے لئے نبی صلے اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اور دوسری چیز وہ عملی صورتیں ہیں جن کو نبیؐ نے ان اصولوں کی پیروی کے لئے خود اپنی زندگی میں اختیار کیا۔ یہ عملی صورتیں کچھ تو حضورؐ کے شخصی مذاق اور طبیعت کی پسند پر مبنی تھیں کچھ اُس ملک کی معاشرت پر جس میں آپؐ پیدا ہوتے تھے اور کچھ اُس زمانے کے حالات پر جن میں آپؐ مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے کسی چیز کو بھی تمام اشخاص اور تمام اقوام اور تمام لوگوں کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔
>
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اول صفحہ ۲۱۱، ۳۱۷)

اس سے ظاہر ہے کہ اس شخص کے عقیدہ کی رُو سے رسول اللہ کے تمام کے تمام ارشادات و فرمودات اور افعال و اعمال کا واجب الاتباع ہونا شروع ہی سے مقصود نہیں تھا۔ ان میں سے وہ تمام امور خارج تھے د۔

> (۱) جنہیں آپؐ نے بحیثیت ایک انسان ہونے کے یا بحیثیت ایک ایسا شخص ہونے کے جو انسانی تاریخ کے خاص دور میں پیدا ہوا تھا، اختیار کیا تھا۔ اور
>
> (۲) تمدن و معاشرت کے معاملات میں وہ عملی صورتیں جنہیں حضورؐ نے اخلاقی اصولوں کو جاری کرنے کے لئے اپنی زندگی میں اختیار فرمایا تھا انہیں تمام اشخاص اور تمام اقوام کے لئے سنت بنا دینا مقصود نہ تھا۔

اس شخص نے حضورؐ نبی اکرم کے فرمودات اور پاکیزہ اعمالِ حیات کے ایک معتدبہ حصے کے واجب الاتباع

ہونے ہی سے انکار نہیں کیا بلکہ اس سلسلہ میں ایک بہت بڑا دعوےٰ بھی کیا ہے اور ایک عظیم خطرہ کا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ یہ امر پہلے سے طے شدہ نہیں کہ ان ارشادات و اعمالِ نبویؐ کا کونسا حصہ حضورؐ کی شخصی زندگی سے متعلق تھا اور کونسا حصہ وہ جس کے سکھانے اور جاری کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیؐ کو مبعوث کیا تھا۔ اس شخص نے کہا یہ ہے کہ اس کا فیصلہ وہ کرے گا جو اچھی طرح دین کے .... مزاج کو سمجھ چکا ہو۔ آپ سوچئے کہ اس سے دین پر عمل کرنے کی شکل کیا پیدا ہوگی۔ اگر ایسا فیصلہ کرنے کا اختیار ہر اُس شخص کو دے دیا جائے جو سمجھ چکا ہو کہ وہ دین کے مزاج کو سمجھ چکا ہے اور اس کا یہ فیصلہ اُس کی اپنی ذات تک محدود ہو تو اس سے اتباعِ سنتِ نبویؐ کے سلسلے میں امت میں ایسی انارکی پیدا ہو جائے گی جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص اپنے اپنے ذوق کے مطابق سنتِ نبویؐ کا اتباع کرے گا۔

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس شخص کا فیصلہ ساری امت کے لئے واجب الاتباع ہوگا تو اس سے اس شخص کو ایسا مقام حاصل ہو جائے گا جو اُسے "مامور من اللہ" بنا دینے کے لئے کافی ہوگا۔ جس شخص کا ہم ذکر کر رہے ہیں اُس کی تحریروں سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا فیصلہ دوسروں کے لئے بھی سند اور حجت قرار پانا چاہیئے۔ مثلاً اُس نے کہا ہے۔

> بعض چیزیں ایسی ہیں جو حضورؐ کے اپنے شخصی مزاج اور قومی طرزِ معاشرت اور آپ کے عہد کے تمدن سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کو سنت بنانا نہ تو مقصود تھا، نہ ان کی پیروی پر اس دلیل سے اصرار کیا جا سکتا ہے کہ حدیث کی رو سے اس طرزِ خاص کا لباس نبیؐ پہنتے تھے اور نہ شرائعِ الٰہیہ اس غرض کے لئے آیا کرتی ہیں کہ کسی خاص شخص کے ذاتی مذاق یا کسی قوم کے مخصوص تمدن یا کسی خاص زمانے کے رسم و رواج کو دنیا بھر کے لئے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سنت بنا دیں ..... میں یہ عقیدہ رکھتا ہوں کہ اس قسم کی چیزوں کو سنت قرار دینا اور پھر ان کے اتباع پر اصرار کرنا ایک سخت قسم کی بدعت اور ایک خطرناک تحریفِ دین ہے جس سے نہایت بُرے نتائج پہلے بھی ظاہر ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ظاہر ہونے کا خطرہ ہے ...... جو امور آپؐ نے عادتاً اختیار کئے ہیں انہیں سنت بنا دینا۔ اور تمام دنیا کے انسانوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ سب ان عادات کو اختیار کریں۔ اللہ اور اُس کے رسول کا ہرگز یہ منشا نہ تھا۔ یہ دین میں تحریف ہے۔
>
> (رسائل و مسائل۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۱۴/۳۰۸، ۳۰۰)

یعنی یہ شخص

(i) تمام کے تمام اعمال و اقوالِ رسولؐ اللہ کو واجب الاتباع نہیں مانتا۔ صرف انہی کو واجب الاتباع مانتا ہے جنہیں آپؐ نے بحیثیت رسول جاری فرمایا تھا۔

(ii) یہ تفریق و تقسیم وہ خود کرتا ہے۔ اور

(iii) جو لوگ اُس عملِ رسولؐ اللہ کو سنت سمجھ کر اختیار کرتے ہیں، ان کے متعلق کہتا ہے کہ وہ

دین میں بدعت اور تحریف کے مرتکب ہوتے ہیں۔
ہم محترم عبدالحمید صدیقی صاحب سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ ان کے نزدیک اس شخص کا شمار ان میں ہوگا جن کا رسول اللہ کی رسالت پر ایمان ہے یا ان میں جو نہایت عیاری سے لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ شخص کچھ اعمالِ نبویؐ کو تو واجب الاتباع مانتا ہے، اس لئے اسے متبع سنت قرار دیا جائے گا، تو یہ دلیل باطل ہے۔ صدیقی صاحب نے کہا ہے کہ جو شخص یہ کہے کہ رسول اللہ کے تمام کے تمام ارشادات و اعمال واجب الاتباع نہیں، وہ منکرِ رسالت ہے۔ لہٰذا اقوال و اعمال رسول اللہ میں سے کسی ایک کے واجب الاتباع ہونے سے بھی انکار حضورؐ کی رسالت سے انکار قرار پائے گا، چہ جائیکہ ان کے اتنے بڑے حصہ کو واجب الاتباع نہ سمجھا جائے۔
اب اگلی شق لیجئے۔ یعنی یہ کہ ارشاداتِ نبویؐ میں تغیر حالات سے تغیر کا معتقد منکرِ رسالت ہو جاتا ہے، تو اس سلسلے میں بھی وہ شخص جس کا ہم ذکر کرتے چلے آرہے ہیں، کہتا ہے کہ:

> یہ حقیقت ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجے کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام زمانوں اور تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقاصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسی بھی ہیں جن میں تغیر حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے۔ جو حالات عہد رسالتؐ اور عہد صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا احکامِ اسلامی پر عمل کرنے کی جو صورتیں اُن حالات میں اختیار کی گئی تھیں، ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور مصالح و حکم کے لحاظ سے ان کی جزئیات میں کسی قسم کا رد و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ دوم۔ صفحہ ۳۲۷)

احکام کی جن دو صورتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان کی تشریح کرتے ہوئے یہ شخص لکھتا ہے کہ

> اب رہ گئے احکام، تو قرآن مجید میں ان کے متعلق زیادہ تر کلی قوانین بیان کئے گئے ہیں اور بیشتر امور میں تفصیلات کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبیؐ نے ان احکام کو زندگی کے معاملات میں جاری فرمایا اور اپنے قول اور عمل سے ان کی تفصیلات ظاہر فرمائیں۔ ان تفصیلات میں بعض ایسی ہیں جن میں ہمارے اجتہاد کو کوئی دخل نہیں۔ ہم پر لازم ہے کہ جیسا عمل رسول اللہ سے ثابت ہے۔ اسی کی پیروی کریں۔ مثلاً عبادات کے احکام۔ اور بعض تفصیلات ایسی ہیں جن سے ہم اصول اخذ کر کے اپنے اجتہاد سے فروع مستنبط کر سکتے ہیں۔ مثلاً عہد نبویؐ کے قوانینِ مدنی۔
>
> (تفہیمات۔ حصہ اول۔ صفحہ ۳۲۲)

اس سے ظاہر ہے کہ یہ شخص ان احکام کو بھی دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے جنہیں رسول اللہ نے بہ حیثیت رسول

جاری فرمایا تھا۔ ایک وہ جن کا تعلق عبادات سے ہے۔ ان کی تفصیلات میں وہ کسی قسم کے تغیر و تبدل کو جائز نہیں سمجھتا۔ اور دوسرے وہ جو مدنیت سے متعلق ہیں۔ ان احکام میں وہ تغیرِ حالات کے لحاظ سے ردو بدل ضروری قرار دیتا ہے۔ اس لئے کہ اُس کے الفاظ میں :-

> جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے، لازم نہیں کہ بعینہٖ وہی حالات ہر زمانہ اور ہر ملک کے ہوں۔

وہ انہیں ناقابلِ تغیر قرار دینے کو رسم پرستی قرار دیتا ہے۔ صدیقی صاحب نے یہ اصول پیش کیا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ

> حضورؐ کے ارشادات و فرمودات اور افعال و اعمال آج کے دور میں تمام کے تمام واجب الاتباع قرار نہیں دیئے جا سکتے۔ موجودہ عصری تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر ان کی صحت اور افادیت کا فیصلہ کرنا ہوگا۔ اُسے رسول اللہؐ کی رسالت پر ایمان رکھنے والا تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

ہم اُن سے یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ جس شخص کا عقیدہ وہ ہو جسے ہم نے اوپر بیان کیا ہے، اُس کے متعلق آپ کا فیصلہ کیا ہے؟ کیا اُسے آپ حضورؐ کی رسالت پر ایمان رکھنے والوں کے زمرہ میں شمار کریں گے یا اُس گمراہ طبقے میں جو بڑی عیاری سے دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے؟

آخر میں ہم یہ واضح کر دیں کہ یہ صاحب جن کا یہ عقیدہ ہے، سید ابو الاعلیٰ مودودی صاحب ہیں جن کی تحریروں کے حوالے ہم نے دے دیئے ہیں۔ صدیقی صاحب انہیں چیک کر لیں اور اپنا اطمینان کر لیں کہ ہم نے ان میں نہ کسی قسم کی کانٹ چھانٹ کی ہے، نہ ردو بدل۔ نہ ہی انہیں ان کے سیاق و سباق سے الگ کیا گیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ صدیقی صاحب جرأت اور دیانتداری سے کام لے کر یہ بتائیں گے کہ اُن کے اپنے پیش کردہ اصول کی روشنی میں مودودی صاحب کے متعلق اُن کا کیا فیصلہ ہے؟ اُن کے جواب کے لئے طلوعِ اسلام کے صفحات حاضر اور ہماری نگاہیں منتظر ہیں۔ اگر وہ اس کا جواب "ترجمان القرآن" میں لکھنا چاہیں تو براہ کرم اس مضمون کو پورے کا پورا شائع کر کے پھر جواب لکھا جائے۔ یہی تقاضائے صحافت و دیانت ہے۔

(بینر)

کراچی میں

ادارۂ طلوعِ اسلام کی مطبوعات حاصل کرنے کیلئے

دفتر بزمِ طلوعِ اسلام کراچی سے رابطہ قائم کریں۔

پتہ:- دار القائد - ۲۰ - ۱/بی - ناظم آباد ۳ (بس سٹاپ)، کراچی ۱۸

فون ۶۱۰۴۶۸

نقد و نظر

اقبالؒ اور قادیانی

مؤلف:۔ نعیم آسی صاحب ۔ ناشر:۔ مسلم اکادمی ۔ وزیر پورہ ۔ سیالکوٹ ۔ شائع شدہ ۔ جون ۱۹۷۷ء ۔
ضخامت:۔ ۱۸۸ صفحات ۔ طباعت، کتابت ۔ دیدہ زیب، قیمت ۔ مجلد بارہ روپے، غیر مجلد نو روپے ۔

تحریکِ "احمدیت" کے سلسلہ میں علامہ اقبالؒ کی ذات عجیب تضادات کا مجموعہ بنا دی جاتی ہے۔ ایکطرف "احمدی" حضرات کی طرف سے ان کی وہ تحریریں پیش کی جاتی ہیں جن میں انہوں نے اس تحریک کی بڑی تعریف کی ہے۔ دوسری طرف ان کی وہ تحریریں ہیں جن میں انہوں نے اس تحریک کو اسلام کے خلاف بغاوت کہہ کر پکارا ہے۔ "احمدی" حضرات علامہ کی وہ تحریریں پیش کرتے ہیں جو انہوں نے کہیں ۱۹۱۰ء میں ارقام فرمائی تھیں۔ اور کبھی نہیں بتلاتے کہ ایسا کچھ انہوں نے کب کہا تھا اور بعد میں ان کے موقف میں کیا تبدیلی واقعہ ہوئی تھی۔ اپنی (ان) سابقہ تحریروں کے متعلق علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں وضاحت کر دی تھی۔

> جہاں تک مجھے یاد ہے، یہ تقریر میں نے ۱۹۱۰ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کر لینے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ اس تحریک سے بہت پہلے مولوی چراغ (علی) مرحوم نے جو مسلمانوں میں کافی سربرآوردہ تھے اور انگریزی میں اسلام پر بہت سی کتابوں کے مصنف بھی تھے۔ بانی تحریک کے ساتھ تعاون کیا اور جہاں تک مجھے معلوم ہے کتاب موسومہ "براہین احمدیہ" میں انہوں نے بیش قیمت مدد بہم پہنچائی لیکن کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لئے برسوں چاہئیں..... ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت ۔۔ بانیٔ اسلام سے اعلیٰ تر نبوت ۔۔۔ کا دعویٰ کیا گیا اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرتؐ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا۔
>
> ("احمدیت اور اسلام"۔ کتاب زیرِ تبصرہ صفحہ ۵۵)

اس تحریک کی اسلام سے یہی وہ بغاوت تھی جس کی بنا پر حضرت علامہؒ نے ۱۹۳۵ء میں اس کے مختلف گوشوں پر سیر حاصل بحث کرنے کے بعد یہ تجویز پیش کی تھی کہ "احمدیوں" کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس موضوع پر علامہ کے افکار و آراء مختلف مقامات پر بکھرے پڑے تھے۔ نعیم آسی صاحب نے انہیں نہایت سلیقہ سے یکجا کر دیا ہے۔ اور ضروری مقامات پر اپنی تشریحات سے ان کی افادیت میں اضافہ کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں البتہ ہم عام قارئین کے لئے ایک انتباہ بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے مقامِ نبوت کے متعلق اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی ہے۔ غیر فلسفی قارئین کے لئے نہ صرف یہ کہ اس بحث کا کما حقہٗ سمجھنا مشکل ہوتا ہے۔ بلکہ بعض مقامات پر اس سے بہت سے شبہات بھی ابھر آتے ہیں۔ ان مقامات پر سے محفوظ طور پر گذرنے کے لئے بڑی احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔

جہاں تک ختمِ نبوت کے بعد "روحانی یا باطنی واردات" کا تعلق ہے، علامہ اقبالؒ کے ہاں ان کا تذکرہ اکثر آتا ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ یہ "روحانیت" کے مقامات ہیں۔ لیکن ہمارا نظریہ اس سے مختلف ہے۔ ہم اس تجربہ کو محض فنی سمجھتے ہیں، دینی نہیں۔ نبوت ایک منفرد ذریعہ علم تھا (یعنی خدا سے براہ راست علم پانا) جس میں کوئی غیر از نبی کسی معنی میں بھی شریک نہیں ہو سکتا۔ یہ ذریعہ علم، حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی پر ختم ہو گیا۔ اب کوئی بھی خدا سے براہ راست علم حاصل نہیں کر سکتا۔ اسے ختمِ نبوت کہا جاتا ہے۔ پرویز صاحب کی کتاب ــ "ختمِ نبوت اور تحریک احمدیت" ــ نے ان تمام پردوں کو اٹھا دیا ہے۔ اور حقائق بے نقاب ہو کر سامنے آ گئے ہیں۔

پرویز صاحب کی
معرکہ آرا انگریزی کتاب
ISLAM, A CHALLENGE TO RELIGION.
جس نے اپنے ملک کے علاوہ یورپ اور امریکہ کے اربابِ فکر و نظر سے بھی خراجِ تحسین حاصل کیا ہے
قیمت:- (بکس بورڈ کور) -/۲۰ روپے
قیمت:- (خوبصورت جلد کے ساتھ) -/۳۰ روپے
(محصول ڈاک اور پیکنگ علاوہ) جلد حاصل کیجئے۔
ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲۵-بی گلبرگ ۲ لاہور

لاہور میں قیام کیلئے
صاف ستھرے، ہوا دار کمرے، مناسب شرح پر
نیز عمدہ لذیذ اور پسندیدہ کھانوں کے لئے
معیاری طعام گاہ
PARK-WAY
پارک وے ہوٹل
فون ۵۲۲۵۹
آپ کے تشریف آوری کا شکریہ!
مینیجر پارک وے ہوٹل،
نزد ریلوے اسٹیشن۔ لاہور

باسمہٖ تعالیٰ

"تین نمازوں اور نو دن کے روزوں"

کے

پس پردہ کیا ہے

طلوعِ اسلام کنونشن سنہ ۱۹۷۴ء میں پیش کردہ

ایک حقیقت کشا خطاب

محمد اسلام

طلوعِ اسلام کنونیشن سنہ ۱۹۷۴ء

تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کے پسِ پردہ کیا ہے!

—— محترم محمدؐ اسلام (نمائندہ بزم طلوعِ اسلام کراچی)

تحریکِ طلوعِ اسلام نے قرآن کریم کی نشر و اشاعت کے لئے جو حقیر سی کوشش کی اور اسے اس میں جس قدر کامیابی نصیب ہوئی ہم جب اس پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمارا سرِ نیاز بدرگاہِ ربّ العزت قدم قدم پر سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔ تعداد کے اعتبار سے مٹھی بھر انسانوں کی یہ جماعت، ساز و سامان کے لحاظ سے بالکل بے بضاعت، نہ کسی دنیاوی سہارے کی کوئی تائید، نہ کسی گوشے سے کسی قسم کی کوئی امداد۔ ایسے ناساعد حالات اور ان میں کامیابی کا یہ عالم کہ ملک کا کوئی بعید سے بعید تر گوشہ ایسا نہ ہوگا جو اس آواز سے متعارف نہ ہو۔ قوم کے تعلیم یافتہ ہوش مند طبقہ میں کسی نہ کسی نوعیت سے اب قرآن کا چرچا ہو رہا ہے۔ نوجوان طالب علموں کا حلقہ اس آواز سے متاثر ہو رہا ہے۔ یورپ اور امریکہ تک کے علمی گوشوں میں یہ آواز پہنچ چکی ہے اور وہاں کے ریسرچ اسکالرز اس کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لئے محترم پرویز صاحب کے پاس آتے رہتے ہیں۔ اس محیر العقول کامیابی کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ حق کی آواز میں خود اتنا اثر ہوتا ہے کہ وہ ساز و براق کی کمی کو بڑی حد تک پورا کر دیتا ہے اور جو جماعت اس آواز کو لے کر آگے بڑھتی ہے خدا کی کائناتی قوتیں آگے بڑھ کر اس کا ساتھ دیتی ہیں اور دنیا اس نظارہ کو اپنی آنکھ سے دیکھ لیتی ہے کہ ؎

شعاعِ مہر خود بیتاب ہے جذبِ تمنا سے
حقیقت ورنہ سب معلوم ہے پروازِ شبنم کی

حق کی آواز کی تائید کے سلسلہ میں بعض اوقات فطرت کا پروگرام عجیب و غریب ہوتا ہے وہ حق کے مؤیدین کے ذرائع کی کمی کو مخالفین کے زورِ مخالفت سے پورا کر دیتی ہے۔ قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں تحریکِ طلوعِ اسلام کے ساتھ بالکل یہی ہوا۔ ہمارے پاس اتنے وسائل کہاں تھے کہ ہم اتنی قلیل مدت میں اسے اس قدر عام کر سکتے۔ مخالفین کے بے پناہ پروپیگنڈہ نے یہ مقصد جس تیزی سے پورا کر دیا ہے وہ ہمارے حیطۂ تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا۔

طلوعِ اسلام کی مخالفت اتنی شدت سے کیوں کی جاتی رہی اور کی جا رہی ہے، یہ مسئلہ یقیناً غور طلب ہے۔ آیئے مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیں۔

مذہبی فرقہ نہیں

ہمارے یہاں کے مختلف فرقے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہتے ہیں۔ کیونکہ ہر فرقہ اپنا جتھہ قائم رکھنا اور اسے بڑھانا چاہتا ہے پھر قربانی کی کھالیں، زکوٰۃ کا مال و زر، صدقہ و خیرات اور دیگر "مذہبی واجبات" فراہمی انہیں باہمی رقابت پر اکساتی رہتی ہے۔ —— طلوعِ اسلام کوئی مذہبی فرقہ نہیں، اس کی ساری تعلیم قرآن کریم کی روشنی میں

فرقہ بندی اور گروہ سازی کے خلاف ہے۔ وہ وحدتِ اُمت کا داعی اور اخوتِ اسلامی، بلکہ نوعِ انسانی کی عالمگیر برادری کا نقیب ہے جو لوگ اس کی پیش کردہ قرآنی فکر سے متفق ہوتے ہیں وہ کسی نئے فرقے میں داخل ہوتے ہیں اور نہ ہی کسی نوعیت سے باقی مسلمانوں سے الگ اپنا گروہ بناتے ہیں۔ وہ دین میں فرقہ سازی کو شرک سمجھتے ہیں۔ وہ نہ تو عوام کی کھالوں کا خود کو حقدار سمجھتے ہیں نہ ہی زکوٰۃ کے نام پر روپیہ بٹورتے ہیں۔ نہ صدقہ و خیرات اکٹھا کر کے انتخابات لڑتے ہیں نہ ہی وہ ختمِ نبوت کے بعد کسی آنے والے کے ظہور کے قائل ہیں۔ خواہ وہ نبوت کے نام پر ہو یا "مزاج شناس رسولؐ" کے نقاب میں مثیلِ مسیحیت کے نام پر ہو یا مجددیت کی آڑ میں ــــ نبوت اور مجددیت تو ایک طرف، یہ تو اشخاص کی سیادت اور امارت تک کے بھی قائل نہیں۔ اس تحریک کے بانی پرویز صاحب اپنے آپ کو قرآن کریم کے "ایک ادنیٰ طالب العلم" سے زیادہ کچھ نہیں کہتے اور ان کی فکر سے شناسا انہیں مفکرِ قرآن سے زیادہ کچھ نہیں مانتے۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کی مخالفت ایک مذہبی فرقہ کی حیثیت سے ہو ہی نہیں سکتی۔

سیاسی پارٹی نہیں

مذہبی فرقوں سے آگے بڑھئے تو سیاسی پارٹیوں کی آپس میں کشمکش رہتی ہے کیونکہ ہر پارٹی کے سامنے اپنے اپنے مفادات ہوتے ہیں اور اپنے اپنے "سیاسی مقاصد" ــــ اس لئے وہ آپس میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے رہتے ہیں۔ ایک دوسرے پر الزامات لگانا اور انہیں بدنام کرنا ان کی سیاسی مصلحتوں کا تقاضا ہوتا ہے ــــ طلوعِ اسلام کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے ..... بھی نہیں۔ اس کے نزدیک مذہبی فرقوں کی طرح سیاسی پارٹیوں کا وجود بھی اُمت میں تخریب اور دین کی تباہی کا موجب ہے۔ ملتِ اسلامیہ غیر مسلموں کے مقابلہ میں خود ایک پارٹی ہے لہٰذا اسلام میں پارٹیوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ــــ بنا بریں کسی سیاسی حریف کی حیثیت سے بھی طلوعِ اسلام کی مخالفت نہیں ہو سکتی۔

انکارِ حدیث نہیں

طلوعِ اسلام کی مخالفت "انکارِ حدیث" کی بنا پر بھی نہیں کی جا سکتی اس لئے کہ حدیث کے معاملہ میں طلوعِ اسلام کا وہی مسلک ہے جو اس کی سب سے زیادہ مخالفت کرنے والی جماعت کے بانی سید ابوالاعلیٰ مودودی کا ہے۔ بلکہ طلوعِ اسلام کا مسلک ان سے کچھ بہتر ہی ہے۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ احادیث کے موجودہ مجموعوں میں صحیح احادیث بھی ہیں اور غلط بھی۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ صرف صحیح احادیث کو رسول اللہؐ کی طرف ..... منسوب کیا جائے، غلط کو غلط کہا جائے۔ مودودی صاحب کا مسلک اس باب میں یہ ہے کہ:

> کوئی روایت جو رسول اللہ کی طرف منسوب ہو اس کی نسبت کا صحیح اور غلط ہونا بجائے خود زیرِ بحث ہوتا ہے۔ آپ (یعنی فریقِ مقابل، اہلِ حدیث) کے نزدیک ہر اس حدیث کو حدیثِ رسولؐ مان لینا ضروری ہے جسے محدثین سند کے اعتبار سے صحیح قرار دیں۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ ضروری نہیں۔ ہم سند کی صحت کو حدیث کے صحیح ہونے کی لازمی دلیل نہیں سمجھتے۔ (رسائل و مسائل حصہ اول صفحہ ۲۹۰)

پھر فرماتے ہیں۔

> یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ بخاری میں جتنی احادیث درج ہیں ان کے مضامین کو بھی جوں کا توں بلا تنقید قبول کر لینا چاہئے۔ (ترجمان القرآن اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء)

اس بنا پر وہ کہتے ہیں کہ احادیث کے مجموعوں میں کانٹ چھانٹ ضروری ہے۔ ان کے الفاظ ہیں:

> احادیث کی تنقید و تحقیق و ترتیب کا کام جو کچھ ابتدائی تین چار صدیوں میں ہوا ہے وہ اگرچہ نہایت قابلِ قدر ہے مگر کافی نہیں۔ ابھی بہت کچھ اس سلسلہ میں کرنا باقی ہے۔ رہی یہ بات کہ علماء نے پھر یہ کام

> کیوں نہیں کیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جن علماء نے چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کو حرام قرار دے دیا ہو۔ ان کے متعلق یہ پوچھنا ہی غلط ہے کہ انھوں نے حدیث کی چھانٹ پرکھ کا کام کیوں نہیں کیا۔
> (رسائل و مسائل حصہ اوّل صفحہ ۲۴۳)

یہاں تک تو حدیث کے متعلق مودودی صاحب کا مسلک بعینہٖ وہی ہے جو طلوعِ اسلام کا ہے۔ لیکن آگے چل کر ان میں فرق ہو جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ احادیث کے پرکھنے کا معیار یہ ہے کہ جو حدیث قرآن مجید کے خلاف ہو اسے صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مودودی صاحب کا مسلک یہ ہے کہ جس حدیث کو "مزاج شناسِ رسولؐ" کی نگہ البصیرت صحیح کہہ دے اُسے صحیح قرار دیا جائے، جسے اس کی نگاہ غلط کہدے اسے غلط سمجھ لیا جائے۔ (تفہیمات حصہ اوّل۔ صفحہ ۳۲۳-۳۰۲) اور مودودی صاحب کے معتقدین کے نزدیک یہ "مزاج شناسِ رسول" خود مودودی صاحب ہیں۔ یعنی، طلوعِ اسلام کے نزدیک' احادیث کے پرکھنے کی کسوٹی قرآن مجید ہے اور جماعتِ اسلامی کے نزدیک اس کی کسوٹی، مودودی صاحب کی نگاہ ہے۔ ان کے اس معیار کے متعلق جماعتِ اہل حدیث کے سابق صدر مولانا اسمٰعیل (مرحوم) نے فرمایا تھا کہ:

> اگر ایک جماعت عقیدتمندی سے کسی اپنے بزرگ یا قائد کو خدا کا مزاج شناس سمجھ لے یا رسول کا مزاج شناس مقرر کر لے، پھر اسے اختیار دے دے کہ اصولِ محدثین کے خلاف جس حدیث کو چاہے قبول کر لے۔ جسے چاہے رد کر دے .... تو یہ مضحکہ خیز پوزیشن ہمیں یقیناً ناگوار ہے۔ ہم انشاء اللہ آخری حد تک اس کی مزاحمت کریں گے اور سنتِ رسولؐ کو ان ہوائی حملوں سے بچانے کی کوشش کریں گے۔ (جماعتِ اسلامی کا نظریۂ حدیث۔ صفحہ ۶۳)

اور حدیث کے متعلق مودودی صاحب کے اس مقصد سے آگاہ ہو کر دارالعلوم ٹنڈو الہ یار خاں کے شیخ الحدیث مولانا ظفر احمد عثمانی نے کہا تھا کہ:

> یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ گمراہ اور مبتدع ہے۔ جاہلِ اجہل ہے۔ پاگل ہے۔ (مقامِ حدیث۔ جلد دوم۔ پہلا ایڈیشن۔ صفحہ ۱۱-۹-۴)

اس سے ظاہر ہے کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت (نام نہاد) انکارِ حدیث کی بنا پر بھی نہیں کی جاتی۔ کیونکہ مودودی صاحب طلوعِ اسلام سے بھی کہیں بڑھ کر منکرِ حدیث ثابت ہوتے ہیں۔

انکارِ سنت

نہ ہی طلوعِ اسلام کی مخالفت اس بنا پر کی جاتی ہے کہ یہ رسولؐ اللہ کے احکام کو ابدی اور غیر متبدل نہیں مانتا۔ اس لئے کہ اس باب میں بھی مودودی صاحب طلوعِ اسلام سے چار قدم آگے نکل جاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> یہ حقیقت یقیناً ناقابلِ انکار ہے کہ شارع نے غایت درجہ کی حکمت اور کمال درجہ کے علم سے کام لے کر اپنے احکام کی بجا آوری کے لئے زیادہ تر ایسی ہی صورتیں تجویز کی ہیں جو تمام مقامات اور تمام حالات میں اس کے مقصد کو پورا کرتی ہیں لیکن اس کے باوجود بکثرت جزئیات ایسے بھی ہیں جن میں تغیرِ حالات کے لحاظ سے احکام میں تغیر ہونا ضروری ہے جو حالات عہدِ رسالتؐ اور عہدِ صحابہؓ میں عرب اور دنیائے اسلام کے تھے لازم نہیں کہ وہی حالات ہر زمانے اور ہر ملک کے ہوں۔ لہٰذا

احکامِ اسلامی پر عمل کرنے میں جو صورتیں اُن حالات میں اختیار کی گئی تھیں ان کو ہو بہو تمام زمانوں اور تمام حالات میں قائم رکھنا اور حکم کے لحاظ سے ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہ کرنا ایک طرح کی رسم پرستی ہے جس کو روحِ اسلامی سے کوئی علاقہ نہیں۔ (تفہیمات حصہ دوم - ص۳۲۷)

طلوعِ اسلام کا بھی یہی مسلک ہے اس فرق کے ساتھ کہ مودودی صاحب سنتِ رسول اللہ میں تغیر و تبدّل کا حق (غالباً) "مزاج شناسِ رسولؐ" کو دیتے ہیں لیکن طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ حق صرف خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کو حاصل ہے، کسی اور کو نہیں - اور طلوعِ اسلام کی دعوت اس نظامِ خلافت کا احیاء ہے۔

تین نمازیں - نو روزے

نہ ہی یہ مخالفت اس بنا پر کی جاتی ہے کہ طلوعِ اسلام تین نمازیں یا نو روزے کہتا ہے - یہ اس لئے کہ طلوعِ اسلام کا مسلک یہ ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ ارکانِ اسلام جس شکل اور جن تفصیلات کے ساتھ اُمت میں مروّج ہیں کسی شخص یا فرد کو حق حاصل نہیں کہ ان میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرے یا کوئی نیا طریق وضع کرے - پرویز صاحب خود بھی پانچ وقت کی نمازوں اور رمضان المبارک کے مہینہ بھر کے روزوں کے قائل ہیں اور ہم بھی انہیں اسی طرح مانتے ہیں - یہ کوئی ایسی بات نہیں جو ان مخالفین سے ڈھکی چھپی ہو - ان میں کئی حضرات ایسے ہیں جو پرویز صاحب اور بزمہائے طلوعِ اسلام کے ارکان کو اسی طرح نمازیں پڑھتے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں۔

فرقہ اہلِ قرآن

اس سلسلہ میں ایک بات بڑی دلچسپ ہے - یہاں ایک فرقہ ہے جو اہلِ قرآن کے نام سے مشہور ہے - ان کا عقیدہ یہ ہے کہ نماز، روزہ وغیرہ کی تمام جزئیات بھی قرآن مجید کے اندر موجود ہیں - چنانچہ انہوں نے بزعمِ خویش قرآن مجید سے ایک نئی قسم کی نماز نکالی ہے جو امت میں مروجہ طریقوں سے مختلف ہے - ان کا ایک گروہ تین نمازوں کا قائل ہے اور بعض نو روزوں کے قائل ——— اگر تین نمازیں اور نو دن کے روزے وجۂ مخالفت ہوتے تو چاہئے تھا کہ یہ لوگ فرقہ اہلِ قرآن کی مخالفت کرتے - لیکن آپ نے کبھی ان کی زبانوں سے اس فرقہ کا نام تک نہیں سنا ہوگا - تین نمازیں اور نو دن کے روزے اہلِ قرآن کا مسلک ہے لیکن یہ "صالحین" انہیں طلوعِ اسلام کے سر منڈھ کر اسے گلی کوچے، محلے محلے بدنام کرتے رہتے ہیں - اور یہ اس لئے کہ مودودی صاحب کا ارشاد ہے کہ "اسلام میں زندگی کی بعض اہم ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنے کی نہ صرف اجازت ہے بلکہ ایسا کرنا واجب ہو جاتا ہے"۔ (ترجمان القرآن مئی ۱۹۵۸ء) سچ کی تو ایک حد ہوتی ہے جس سے آگے وہ نہیں جا سکتا، لیکن جھوٹ کی کوئی حد نہیں ہوتی - اُسے جہاں تک جی چاہے لے جائیے - حضرات طلوعِ اسلام کے خلاف کذب بیانی کو کس حد تک آگے لے جاتے ہیں اس کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے - جماعت اسلامی کے ترجمان ہفت روزہ ایشیا کی (۳۰ اپریل ۱۹۶۲ء کی) اشاعت میں مولانا گوہر رحمان، ہوتی مردان کے نام سے ایک مقالہ شائع ہوا جس کا عنوان تھا ——— "ناموسِ رسالتؐ اور منکرینِ حدیث" ——— اس مقالہ کی پہلی سطر یہ تھی۔

فتنۂ انکارِ سنت اور پرویزی مکتبۂ فکر کے ماہنامہ "بلاغ القرآن" نے تحفظ ناموسِ رسالت کے پُر فریب نام پر صحیح اور ثابت شدہ احادیثِ رسولؐ کے خلاف ایک سلسلۂ مضامین شروع کر رکھا ہے ....

اور آپ کو شائد معلوم ہو گا کہ ماہنامہ بلاغ القرآن کو نہ طلوعِ اسلام سے کوئی تعلق ہے نہ پرویز صاحب سے کوئی واسطہ - یہ فرقہ اہلِ قرآن کا ماہنامہ ہے - کیا آپ سمجھتے ہیں کہ لاہور کا ایک ہفت روزہ - لاہور ہی کے ایک ماہنامہ کے متعلق اتنا بھی نہیں جانتا تھا کہ

اس کا تعلق پرویز صاحب سے نہیں۔ طلوعِ اسلام نے جب اپنے ہاں وضاحت کی کہ یہ ماہنامہ اہلِ قرآن کا ہے ہمارے ساتھ اس کا کوئی واسطہ نہیں تو نہ ایشیا نے اس پر معذرت کی ضرورت سمجھی نہ اس کے مقالہ نگار نے اظہارِ ندامت کی حاجت ۔۔ وہ کیوں اظہارِ معذرت و ندامت کرتے جبکہ وہ سب کچھ جانتے بوجھتے دیدہ و دانستہ یہ جھوٹ بول رہے تھے۔

اُردو میں نماز

لہٰذا عزیزانِ محترم! طلوعِ اسلام کی مخالفت تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کی وجہ سے بھی نہیں۔ کوئی بیس سال اُدھر کی بات ہے لاہور میں کسی منچلے نے عید کی نماز اُردو میں پڑھائی۔ جب اس واقعہ کی خبر طلوعِ اسلام کو کراچی میں پہنچی تو اس نے اس فتنہ کا فوری سدِباب کیا اور لاہور کے در و دیوار پر بڑے بڑے پوسٹر اس کے خلاف لگوائے۔ لاہور اور کراچی کے ہزاروں انسانوں نے ان پوسٹروں کا مطالعہ کیا اور طلوعِ اسلام کے اس بروقت اقدام پر اس کی تعریف کی۔ محترم پرویز صاحب کے مفہوم القرآن کا جب پہلا پارہ شائع ہوا تو اس کے تعارف کے صفحہ "ح" پر انہوں نے تحریر فرمایا۔

> حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم کا ترجمہ خواہ وہ دنیا کی کسی زبان میں بھی کیوں نہ ہو قرآنی مفہوم کو واضح کر ہی نہیں سکتا ۔۔۔ حتیٰ کہ اگر قرآن کریم کے الفاظ کی جگہ، خود عربی زبان کے دوسرے الفاظ رکھ دئے جائیں تو بھی بات کچھ سے کچھ ہو جائے گی۔ قرآن کریم کا انداز اور اسلوب بالکل نرالا ہے یہ اپنی مثال آپ ہے۔ الفاظ تو اس کے عربی زبان ہی کے ہیں لیکن ان میں جامعیت اس قدر ہے کہ نہ ان الفاظ کی .... جگہ دوسرے الفاظ لے سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی ترتیب میں رد و بدل کرنے سے وہ بات باقی رہتی ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے ترجمہ میں اس کا پورا مفہوم آ نہیں سکتا......

اگر ان دو جلی اور خفی تحریرات کے منظرِ عام پر آنے کے بعد بھی اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ طلوعِ اسلام نے اُردو میں نماز پڑھانے کا طریقہ ایجاد کیا ہے تو کم از کم میں تو اسے باور کرنے پر آمادہ نہیں ۔۔۔ طلوعِ اسلام کے مخالفین کو میں جاہل تو سمجھ سکتا ہوں، اندھا نہیں کہہ سکتا۔ یہ قدِ آدم پوسٹر کوئی "عید کا چاند" نہیں تھے جو کسی کو نظر نہ آئے۔ اس لئے عیرالنظر یہ تو اس بارے میں بھی یہی ہے کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت کی یہ وجہ بھی ہرگز نہیں ہو سکتی۔

کمیونزم

اب رہی یہ بات کہ طلوعِ اسلام بار بار قرآن کریم کی یہ آیات منظرِ عام پر لاتا ہے ۔۔۔ وَمَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا۔ (۱۷/۲۰) اور جو کچھ تیرے رب کی طرف سے بطور بخشش عطا ہوا ہے اسے روکا نہیں جا سکتا۔ لَيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ (۵۳/۳۹) معاوضہ بقدرِ محنت، کائنات کا قانون ہے ۔۔۔ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ (۵۷/۱۰) ۔۔۔ اَلْاَرْضُ لِلّٰهِ ۔۔۔ یا پھر یہ کہ وہ اس فرمانِ نبی اکرمؐ کو بار بار دہراتا رہتا ہے ۔۔۔ "زمین اللہ کی ہے اور بندے بھی اللہ کے ہیں اس لئے اللہ کی زمین اللہ کے بندوں کے لئے کھلی رہنی چاہیئے۔" (ابو داؤد) ۔۔۔ حضرت رافع بن خدیجؓ راوی ہیں کہ انہوں نے ایک کھیت میں کاشت کر رکھی تھی کہ ادھر سے رسول اللہؐ کا گذر ہوا۔ وہ کھیت میں پانی دے رہے تھے۔ حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ زمین کس کی ہے اور اس میں کاشت کون کرتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ بیج بھی میں ڈالتا ہوں اور کاشت بھی میں کرتا ہوں لیکن زمین فلاں کی ہے اس لئے پیداوار کا ایک حصہ میرا ہوتا ہے اور ایک حصہ وہ لے جاتا ہے۔ اس پر آپؐ نے فرمایا کہ تم دونوں سودی کاروبار کرتے ہو، زمین اس کے مالک کو لوٹا دو اور جو کچھ تم نے خرچ کیا ہے اُسے واپس لے لو۔ (ابو داؤد کتاب البیوع)

خدا اور رسولؐ کے ان احکامات کی نشرواشاعت کرنے والے طلوعِ اسلام کے متعلق یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کمیونزم کا حامی ہے بالخصوص جبکہ وہ متعدد بار لکھ چکا ہے کہ "نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان"۔ لہٰذا طلوعِ اسلام کی مخالفت اس بنا پر بھی نہیں کی جا رہی۔

قلتِ وقت مانع ہے ورنہ میں ان جھوٹے الزامات کی چند ایک اور مثالیں پیش کرتا جو ہمارے علماء حضرات کی طرف سے پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام پر لگائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں ایک واقعہ ایسا ہے جس کا ذکر کئے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ حال ہی میں جب قادیانوں کا مسئلہ پارلیمان میں پیش ہوا ہے تو راولپنڈی کے در و دیوار پر بڑے بڑے پوسٹر چسپاں پائے گئے جن میں جلی حروف میں "قادیانیت اور پرویزیت" کو ایک ہی ترازو کے دو پلڑے اور ایک ہی فتنہ کی دو شاخیں قرار دیا گیا تھا اور تاثر یہ دیا گیا تھا کہ پرویز صاحب بھی مرزا قادیانی کی طرح ختمِ نبوت کے منکر ہیں۔ وہاں سے یہ شوشہ چھوڑا گیا اور صالحین نے اسے سارے ملک میں پھیلا دیا۔ اب تک اس کی صدائے بازگشت اکثر گوشوں سے سنائی دیتی ہے۔ آیئے میں بتاؤں کہ جس شخص پر انکارِ ختمِ نبوت کی یہ مہر لگائی جاتی ہے، فتنہ انکارِ ختمِ نبوت کے خلاف جہاد میں اس کا کارنامہ کیا ہے۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں (سابق) ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ دائر کیا کہ چونکہ اس کا خاوند مرزائیت اختیار کر کے دائرہ اسلام سے خارج ہو گیا ہے اس لئے اس کے ساتھ اس کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیرِ سماعت رہا جس میں ملک کے چوٹی کے علماء کرام نے مرزائیت کے خلاف بحث میں حصہ لیا۔ نو سال کے بعد ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر، محترم محمد اکبر (مرحوم) نے اپنا فیصلہ سنایا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ اس مسئلہ پر سالہا سال تک بحث ہوتی رہی لیکن مجھ پر یہ واضح نہ ہو سکا کہ نبیؐ کی صحیح (DEFINITION) کیا ہے اور مقامِ نبوت کیا۔ اس وجہ سے میں اس مقدمہ کا فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔ حسنِ اتفاق سے ایک رسالہ میں میں نے چوہدری غلام احمد پرویز نامی ایک صاحب کا ایک مقالہ پڑھا، جس نے مقامِ نبوت کی حقیقت کو اس طرح واشگاف کر دیا کہ مرزا غلام احمد کے دائرہ اسلام سے خارج ہونے کے بارے میں کوئی شبہ نہ رہا۔ اب میں اس مقدمہ کا فیصلہ صادر کرتے ہوئے مدعیہ کا نکاح مدعا علیہ سے فسخ قرار دیتا ہوں۔

اس فیصلہ نے سارے ملک میں تہلکہ مچا دیا۔ وہ فیصلہ الگ شائع کیا گیا۔ ہاتھوں ہاتھ بٹا۔ اس کے بعد بھی وہ فیصلہ کتابی شکل میں متعدد بار شائع ہوا۔ سنہ ۱۹۷۳ء میں اسے محفلِ ارشادیہ سیالکوٹ نے بھی شائع کیا۔ مرزائیت کے خلاف حالیہ تحریک کے دوران .. اس کا بڑا شہرہ ہوا۔ "احمدیوں" کے متعلق حکومت کے حالیہ فیصلہ کے بعد ملک کے کم و بیش ہر اخبار اور ہر مجلہ میں مقدمہ بہاولپور کا ذکر خصوصیت سے آیا ہے اور ان علماء کرام کی بارگاہ میں گلہائے عقیدت و تبریک پیش کئے گئے ہیں جن کا ذکر اس میں آیا ہے۔ حتیٰ کہ ایک صاحب نے یہ بھی تجویز کیا ہے کہ محمد اکبر (مرحوم) جج کی یادگار قائم کی جائے۔

گذشتہ تین ماہ سے ملک بھر میں یہ چرچا ہو رہا ہے لیکن آپ یہ معلوم کر کے حیران ہوں گے کہ کسی ایک کی زبان یا نوکِ قلم پر اس پرویز کا نام تک نہیں آیا جس کا مضمون اس زندۂ جاوید فیصلہ کی بنیاد بنا تھا۔ یہی نہیں کہ اس کا نام تک نہیں لیا گیا ــــ اُسے منکرِ ختمِ نبوت قرار دے کر مرزائیوں کی صف میں کھڑا کیا جا رہا ہے۔

میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کسی سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو اس کے خلاف اس قسم کی بددیانتی اور خیانت کی مثال آپ کو کہیں اور بھی مل سکے گی؟ اور یہ تمام وہ حضرات ہیں جو اپنی خدمتِ اسلام، تقویٰ اور پرہیزگاری اور صالحیت کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے ہیں۔ وہ فیصلہ کتابی شکل میں اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور اس کے صفحہ ۱ پر پرویز سے متعلق واقعہ درج ہے۔

اس مقام پر آپ یہ معلوم کرنے کے لئے یقیناً بے تاب ہوں گے کہ پرویز صاحب اور طلوعِ اسلام کے خلاف اس قدر دروغ بیانی اور الزام تراشی اور اس حد تک بُغض و عداوت کے حقیقی اسباب کیا ہیں۔ انہیں میں مختصر طور پر پیش کئے دیتا ہوں اور اسے آپ پر چھوڑتا ہوں کہ میرے پیش کردہ اسباب سے آپ کس درجہ متفق اور مطمئن ہیں۔

مخالفت کے حقیقی اسباب

طلوعِ اسلام کی مخالفت کی ابتداء یہاں سے ہوتی ہے کہ جب قائدِ اعظم دو قومی نظریہ کی اساس پر تحریکِ پاکستان کو لے کر اٹھے تو ان کے مدِمقابل تین قوتیں تھیں۔ انگریز۔ ہندو اور نیشنلسٹ مسلمان، جن کی قیادت مولوی صاحبان کر رہے تھے۔ قائدِ اعظم، انگریز اور ہندو کا مقابلہ نہایت عمدگی اور آسانی سے کر سکتے تھے لیکن اربابِ تقدس کا یہ طائفہ جو قال اللہ و قال الرّسول کی سپر میں آمادہ بہ مخالفت تھا اس کی روک تھام ان کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ محاذ پرویز صاحب کے سپرد ہوا۔ پرویز صاحب کے مدِمقابل (مولانا) ابوالکلام آزاد اور ان کا پورا حلقۂ عقیدت (مولانا) حسین احمد مدنی اور ان کے ساتھ (باستثنائے چند) دیوبندی مکتبۂ فکر کے جملہ علماء۔ جمعیت علمائے ہند۔ مجلس احرار۔ خان عبدالغفار خان کے سرخپوش۔ جماعتِ اسلامی وغیرہ تمام مخالفینِ پاکستان تھے۔ پرویز صاحب نے اس پورے محاذ کو کس ہمت سے سنبھالا اور اس چومکھی لڑائی کو کس حوصلہ مندی اور تدبر سے لڑا اس کی شہادت میں طلوعِ اسلام کے فائل تاریخی نوعیت کے حامل ہیں۔

دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کے سلسلہ میں یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ قومیت کی تشکیل رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک سے نہیں ہوتی بلکہ دین کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ دین ہی مسلمانوں کے لئے وجۂ جامعیت ہے جو انہیں وطن کی جغرافیائی حدود سے ماوراء لے جا کر ایک عالمگیر برادری بنا دیتا ہے۔ اس کے نزدیک عرب کا بسنے والا عمرؓ اور روم کا رہنے والا صہیبؓ دین کے اشتراک کی بناء پر ایک قوم کے فرد ہوتے ہیں اور رنگ کے باشندے اور خون کے رشتے میں منسلک، ابوبکرؓ اور ابوجہل دو الگ الگ قوموں کے افراد —— یہ وہ فراموش کردہ حقیقت تھی جس کا دورِ حاضر میں سرسید علیہ الرحمۃ نے سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں اعلان کیا اور اسی بنا پر ان اصلاحات کی مخالفت کی جو ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک قوم تصوّر کر کے ہندوستان میں نافذ کی جا رہی تھیں۔ سرسید کے بعد علامہ اقبالؒ نے قرآن کی اس تعلیم کو عام کرنے کا بیڑا اٹھایا اور اپنے مخصوص حسین، بلیغ اور دلکش انداز میں ساری عمر اسے عام کرتے رہے۔ علامہ اقبالؒ نے سنہ ۱۹۳۰ء میں اسی دو قومیتوں کے فلسفہ کی بنیاد پر مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا تصوّر پیش کیا۔ سیکولر انداز سیاست میں قوم کی تشکیل وطن کے اشتراک سے ہوتی ہے۔ نیشنلسٹ علماء اس کے حامی تھے۔

پاکستان کے مخالفین میں سے ایک طبقہ کی کوشش تو یہ تھی کہ مملکت کا پورا اقتدار مذہبی پیشوائیت کے ہاتھ میں رہے اور حکمران طبقہ ان کے خود ساختہ فیصلوں کو نافذ کرنے کی مشینری کا کام دے۔ اس انداز کو "تھیاکریسی" کہتے ہیں۔ دوسرا طبقہ اس پر مصر تھا کہ امورِ مذہب مذہبی پیشوائیت کی تحویل میں رہیں اور امورِ سیاست حکومت کو تفویض کر دئے جائیں۔ اسے سیکولر اندازِ حکومت کہا جاتا ہے۔ ہمارے قرونِ اوّل کے بعد جب دین مذہب میں تبدیل کر دیا گیا تو مسلمانوں کی حکومتوں کا انداز سیکولر ہی رہا۔ اسی انداز کو انگریزوں نے ہندوستان میں بھی قائم رکھا۔ ان کے عہدِ حکومت میں بھی پبلک لاز حکومت کی تحویل میں تھے اور پرسنل لاز اربابِ شریعت کے سپرد۔ تحریکِ پاکستان کے دوران جب ہندو نے بازی ہارتے دیکھی تو نیشنلسٹ علماء کو اس نے اپنے اعتماد میں لیا اور انہیں یہ یقین دلایا کہ انگریز کے چلے جانے کے بعد مملکت کا نظام بدستور سیکولر رہے گا اور تمہاری مذہبی اجارہ داری مسلمانوں پر

قائم رہے گی۔ اس لالچ میں مذہبی پیشوائیت نے ہندو سے مفاہمت کر لی۔ چنانچہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے سرخیل مولانا ابوالکلام آزاد نے "بھگتی یا برہمو سماجی تحریک" کا احیا کیا اور اس نظریہ کی تبلیغ بڑی شدومد سے شروع کردی کہ عالم گیر سچائیاں دنیا کے ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اس لئے تمام مذاہب سچے ہیں لیکن پیروانِ مذہب سچائی سے منحرف ہوگئے ہیں۔ اسلام کہتا ہے کہ اگر وہ اپنی فراموش کردہ سچائی از سر نو اختیار کرلیں تو میرا کام پورا ہوگیا۔ یہ فراموش کردہ سچائی کیا ہے؟ ایک خدا کی پرستش اور نیک عملی کی زندگی۔ یہ کسی ایک گروہ کی میراث نہیں کہ اس کے سوا کسی انسان کو نہ ملی ہو۔ یہ تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہے ـــــ مولانا حسین احمد مدنی نے سیکولر نظامِ حکومت کی تائید کے لئے ہندو کے پیش کردہ اس نظریہ کی تبلیغ شروع کردی کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں"۔ جب مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی نے دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کی مخالفت کا یہ رخ اختیار کیا تو ہندو کی جرأتیں بیباک ہوگئیں۔ چنانچہ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے اپنی ایک تقریر میں واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ:

> اب یہ ناممکن ہے کہ کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کیا جاسکے جس کی بنیاد مذہب پر ہو۔ اب وقت آچکا ہے کہ ہم اس امر کا اعتراف کرلیں اور اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ مذہب اور خدا کو ان کے مناسب مقام یعنی آسمان کی بلندیوں پر رکھ دیا جائے اور انہیں خواہ مخواہ زمین کے معاملات میں گھسیٹ کر نہ لایا جائے اس بات کا تصور بھی ناممکن ہے کہ اگر مذہب کو سیاست سے الگ نہ کیا جائے تو کوئی نظامِ حکومت قائم رہ سکتا ہے۔ عہدِ حاضر میں بہترین نظامِ حکومت کی بنا اس نظریہ پر قائم ہوسکتی ہے کہ جغرافیائی حدود کے اندر گھرا ہوا ایک ملک ہو اور اس ملک کے اندر رہنے والے تمام افراد معاشی اور سیاسی مفاد کے رشتہ میں منسلک ہوکر ایک متحدہ قومیت بن جائیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" میں کہا ہے کہ جب کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی نے بھی تقسیم ملک کی تجویز کی حمایت کردی تو ـــــ خان عبدالغفار خاں کی حالت قابلِ دید تھی، وہ سکتہ کے عالم میں ڈوب گئے۔ وہ ساکت و صامت بیٹھے تھے۔ ان کی زبان پر ایک لفظ تک نہ آتا تھا۔ اس کے بعد خان صاحب نے کانگریس کے لیڈروں سے پُرزور اپیل کی وہ ایسا نہ کریں۔ انہوں نے کہا ـــــ اگر کانگریس نے تقسیم کا فیصلہ کرکے خدائی خدمت گاروں کو بھیڑیوں کے آگے ڈال دیا تو صوبہ سرحد اسے غداری قرار دیگا۔

مولانا آزاد کی شہرت اس زمانہ میں تا بہ ثریا پہنچی ہوئی تھی۔ وہ قلم اور زبان کے بادشاہ اور علم کے سمندر سمجھے جاتے تھے۔ علماء حضرات کی صف میں وہ امام الہند قرار دئیے جاتے تھے۔ اتنے بڑے مولانا کی مخالفت اور وہ بھی ایک غیر مولوی پرویز کی طرف سے! کسی کے حیطۂ تصور میں بھی نہ آسکتی تھی۔ پرویز صاحب نے متحدہ قومیت اور اس کے علمبرداروں پر جو ضرب کاری لگائی اس سے نیشنلسٹ علماء بلبلا اُٹھے اور انہوں نے طلوعِ اسلام کے خلاف ایک محاذ کھڑا کردیا۔ یہ تھی پہلی وجہ طلوعِ اسلام کی مخالفت کی۔

تھیاکریسی

طلوعِ اسلام کی یہ مخالفت تقسیمِ ہند کے بعد ختم ہو جانی چاہیئے تھی کیونکہ دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کی حمایت مسلمانوں کی غالب اکثریت نے کی تھی اور یہ اکثریت پاکستان میں قرآنی نظامِ حیات متشکل کرنے کی آرزومند تھی اور یہی طلوعِ اسلام کا نصب العین تھا۔ لیکن دیکھنے والوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ پاکستان بنتے ہی مخالفین کا یہ انبوہ کثیر یہاں آموجود ہوا ـــــ اور جب پاکستان کے دستور و آئین کی تدوین کا مسئلہ سامنے آیا تو پاکستان کے ان دشمنوں نے شور مچانا شروع کردیا کہ (ہم نے) پاکستان اس لئے حاصل کیا ہے کہ یہاں "اسلامی حکومت" کا قیام ہو۔ اسلامی حکومت کے معنی قانونِ شریعت کے نفاذ کے ہیں اور قانونِ شریعت کا ترجمان علماء کرام کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا اس لئے مملکت کے جملہ اختیارات مُلّا کے ہاتھوں میں دئے

جائیں جو "خدا اور رسولؐ" کے نقاب میں من مانی کر سکیں اور اس طرح مسلمانوں کی اس کامیابی کو خاک میں ملا کر یہاں تھیاکریسی یا سیکولر نظام رائج کر سکیں۔

سامعینِ کرام! یہ ایک ایسی خطرناک تحریک تھی جس کے انسانیت سوز اور حریت کش نتائج کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جن کی نگاہیں تاریخ کے اوراق پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں ان ادوار سے بدتر دور کوئی نہیں جس میں اقتدار کی مسندیں مذہب پرست گروہ کے تسلط میں رہیں۔ مصر ہو یا چین، روم ہو یا ہند، شام ہو یا عراق۔ جب اور جہاں زمامِ اقتدار پادری، پنڈت یا مُلّا کے ہاتھ میں آئی انسانیت بری طرح تباہ و برباد ہوئی۔ دنیا میں جس قدر مظالم "خدا کے نام پر" ڈھائے گئے ابلیس کے حصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہ آیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے جو قرآن نے ملوکیت اور سرمایہ داری کے ساتھ مذہبی پیشوائیت کو بھی شرفِ انسانیت کا بدترین دشمن قرار دیا ہے اور جس نظام کی تشکیل محمدٌ رسول اللہ و الذین معہٗ کے مقدس ہاتھوں سے ہوئی تھی اس میں مذہبی پیشوائیت کا نشان تک نہیں ملتا۔ حتیٰ کہ مولوی اور مولانا کی اصطلاحیں بھی دورِ ملوکیت کی ایجاد ہیں۔ اس پس منظر میں آپ سوچئے کہ دستورِ پاکستان کے سلسلہ میں مُلّا جس مطالبہ کو لے کر آگے بڑھا تھا وہ کس قدر خطرناک تھا۔ ہمارے سادہ لوح عوام اس کی چال کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے۔ باقی رہے خواص، وہ ابھی مُلّا کے ریت کے پہاڑ سے خوف زدہ ہو کر ان سے سودا بازی میں مصروف رہے۔ لیکن طلوعِ اسلام اس سازش کو برداشت نہیں کر سکتا تھا جس سے نہ صرف وہ مقصدِ عظیم فوت ہو جاتا تھا جس کے لئے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا بلکہ انسانیت کو ازمنۂ مظلمہ کے جہنم کے غاروں میں دھکیلا جا رہا تھا۔ چنانچہ وہ پھر میدانِ عمل میں آیا اور اس نے مذہبی پیشوائیت کی اس گہری سازش کو بے نقاب کر کے پاکستان کے مسلمانوں کو بتایا کہ قرآنی مملکت میں قانون سازی کے اصول کیا ہیں اور متحدہ قومیت کے پٹھے ہوئے مہرے کس طرح تھیاکریسی اور سیکولر نظام نافذ کر کے دو قومی نظریہ اور نظریۂ پاکستان کی بنیادوں کو مذہب کی آڑ میں کھوکھلا کر رہے ہیں۔ طلوعِ اسلام کے اس سازش کو بے نقاب کرنے کے باوجود خواجہ ناظم الدین مرحوم کی حکومت میں مجلسِ دستور ساز کی بنیادی اصولوں کی کمیٹی نے وہ سفارشات پیش کر دیں جن کی رُو سے ملک میں قانون سازی کا آخری اختیار مُلّا کے ہاتھ میں دیا جا رہا تھا کہ مجلس آئین ساز ٹوٹی اور اس کے ساتھ ہی بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی سفارشات جو قطعاً غیر قرآنی تھیں غتربود ہو گئیں۔ لیکن اس کے بعد بھی مُلّا اور طلوعِ اسلام کی یہ کشمکش مسلسل جاری رہی۔ وہ اقتدارِ حکومت اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا، یہ اُسے "خدا کے ہاتھ" میں دینے کے لئے مصروف جد و جہد تھا اور اب تک ہے۔

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ طلوعِ اسلام کی مخالفت درحقیقت اس قرآنی آواز کی مخالفت ہے جسے یہ بلند کرتا ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں ـــ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۶/۳۳) یہ تیری مخالفت نہیں کرتے یہ مخالفت کرتے ہیں قانونِ خداوندی کی جن کا یہ انکار کرتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ ملک میں لاکھوں کی تعداد میں ایسا لٹریچر شائع ہو رہا ہے جو نہ صرف دین کی اصل و بنیاد کے خلاف ہے بلکہ وہ قوم کے اخلاق تک کو تباہ کرتا ہے۔ ان حضرات نے کبھی متحدہ محاذ بنا کر یہ مطالبہ نہیں کیا کہ اس لٹریچر کو ضبط کیا جائے۔ قوم میں ہزارہا افراد ایسے ہیں جو خدا، رسول، وحی، آخرت کا نہ صرف انکار کرتے ہیں بلکہ ان کا (معاذ اللہ) مذاق اڑاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو دہریہ ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ ان "مقدسین" کی طرف سے ان کے خلاف کبھی کفر کا کوئی فتویٰ صادر نہیں ہوا۔ لیکن ان حامیانِ دینِ مبین کی رگِ حمیت پھڑکتی ہے تو ان لوگوں کے خلاف جو خدا، رسولؐ، کتاب، ملائکہ، آخرت پر خالصتہً اس طرح ایمان رکھتے ہیں جس طرح قرآن کا مطالبہ ہے۔ جو کوشش کرتے ہیں کہ خدا کی کتاب کا نور اقصائے عالم میں پھیل جائے۔ جن کی سعی و کاوش کا منتہیٰ یہ ہے کہ مسلمانوں میں پھر سے وہ صحیح اسلامی نظام قائم

ہوجائے جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال پہلے حجاز کی سرزمین میں مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے متشکل ہوا تھا اور جس کے قیام میں انسانیت کی فوز و فلاح کا راز پنہاں ہے۔ ان لوگوں کے خلاف شرق سے غرب تک متحدہ محاذ قائم کیا جاتا ہے اور مخالفت کا طوفان برپا کر دیا جاتا ہے۔ یہ سب کس جرم کی بنا پر؟ اس بنا پر کہ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ——— یہ کہتے ہیں کہ ہمارا آقا صرف اللہ ہے ——— وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ——— ہم اسی کے احکام و قوانین کے سامنے جھکتے ہیں اور کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔

جیسا کہ میں نے ابھی ابھی عرض کیا ہے یہ مخالفت ہماری نہیں، قرآن کی آواز کی مخالفت ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کسی انسان کا اقتدار و اختیار کسی دوسرے انسان پر رہنے نہیں دیتا۔ وہ کسی کو اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کی کمائی پر عیش اڑائے۔ وہ خدا اور بندے کے درمیان کسی طاقت کو حائل نہیں ہونے دیتا خواہ وہ آسمانی حقوق کی مدعی ملوکیت ہو یا خدائی نیابت کی دعویدار پیشوائیت یا نام نہاد مامور یت اللہ من اللہ۔ بالفاظ دیگر ——— موت کا پیغام ہر نوع غلامی کے لئے ——— لہٰذا جو قوتیں دوسروں کو اپنا محکوم اور غلام رکھنا چاہتی ہوں وہ قرآنی آواز کے عام ہونے کو کب گوارا کر سکتی ہیں۔ اندریں حالات ان حضرات کی طرف سے اس فکر کی مخالفت قابلِ فہم ہے۔

قرآن کریم سے ان حضرات کی مخالفت (بلکہ معاذ اللہ نفرت) اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص یونہی بلا ارادہ کہہ دے کہ ہمیں اس معاملہ میں قرآن کی طرف رجوع کرنا چاہیئے تو یہ تلملا اٹھتے اور شور مچا دیتے ہیں کہ یہ پرویزی ہے اور وہ بیچارہ ہکا بکا رہ جاتا ہے کہ مجھ سے کیا قصور سرزد ہو گیا۔ قرآن کریم کی مخالفت اور نفرت کی انتہا ہے کہ ان حضرات نے یہ فتویٰ بھی صادر کر رکھا ہے کہ حَسْبُنَا کتاب اللہ کہنے والے کافر ہیں ——— یعنی اب یہ حضرات قرآن کریم کا نام تک سننا گوارا نہیں کر سکتے۔ کتنی گہری نفسیاتی حقیقت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے کہ وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ؕ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (۱۷/۴۱) ہم قرآن میں حقائق کے مختلف گوشوں کو لوٹا لوٹا کر لاتے ہیں تاکہ یہ اس سے نصیحت حاصل کریں لیکن اس سے ان کی نفرت اور زیادہ ہو جاتی ہے۔

جھوٹا پراپیگنڈہ

اگر یہ حضرات اپنی مخالفت میں دیانتداری سے کام لیتے اور نشتر کرتے کہ ہماری مخالفت کی وجہ یہ ہے تو ہمیں ان سے کوئی گلہ نہ ہوتا ——— لیکن ایسا کہنے کی ان میں جرأت نہ تھی، اس لئے انہوں نے الزام تراشی اور دروغ گوئی کے حربوں سے کام لیا۔ اس سے ان کا منشا یہ تھا کہ عوام کی نگاہوں میں طلوعِ اسلام اور اس کے بانی پرویز صاحب کو اس قدر قابلِ نفرت بنا دیا جائے کہ وہ ان کی بات تک سننے کے روادار نہ رہیں۔ آپ سوچیئے کہ جب مسلک یہ ہو کہ جھوٹ بولنا شرعاً واجب، اس لئے کارِ ثواب ہے اور پراپیگنڈہ کی مشینری اس قدر وسیع ہو تو پھر مخالفین کی تصویروں کو مسخ کر دینے میں دقت کیا رہتی ہے؟ پراپیگنڈہ کی مشینری کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ سینکڑوں اخبارات، مجلّات، کتابیں ان کے علاوہ، ہر مسجد ان کے پراپیگنڈہ کا مرکز ہے۔ پروپیگنڈہ کی اس قسم کی منظم اور وسیع مشینری تو دنیا کی کسی حکومت کے پاس بھی نہیں ہو گی اس مشینری کے ذریعے یہ پچیس سال سے ان الزامات کو مسلسل پھیلائے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ کسی کے سامنے پرویز صاحب یا طلوعِ اسلام کا نام لیں وہ جھٹ سے کہہ دے گا کہ ہاں وہی! جو تین نمازیں اور نو دن کے روزوں کے قائل ہیں اور اردو میں نماز پڑھتے ہیں۔ اور جب ان سے پوچھئے کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا تو جواب ملے گا کہ ساری دنیا یہ کہتی ہے۔

لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ آپ کچھ وقت کے لئے ساری دنیا کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے چند افراد کو دھوکا دے سکتے

ہیں۔ لیکن ہمیشہ کے لئے ساری دنیا کو دھوکا نہیں دے سکتے، تو یہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ان کا یہ فریب کافی عرصہ تک چلتا رہا ہے لیکن اب زمانے کے تقاضے کے ہاتھوں ان کے اس مقدس نقاب کی دھجیاں فضا میں بکھرنی شروع ہوگئی ہیں۔ اب لوگوں کے سامنے حقیقت بے نقاب ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ ساری فضا قرآنی آواز سے گونج اُٹھے گی اور حریمِ کعبہ مذہبی پیشوائیت کے خود ساختہ بتوں سے پاک اور صاف ہو جائے گا۔ باشعور حلقوں نے اب محسوس کرنا شروع کر دیا ہے کہ مُلّا کی طرف سے طلوعِ اسلام کی یہ مخالفت اقرار و انکارِ حدیث یا تین نمازوں اور نو دن کے روزوں کی بنا پر نہیں۔

یہ مخالفت ہے خدا کے عطا فرمودہ نظامِ حیات اور انسانوں کے خود ساختہ نظامِ زندگی کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے دین اور مذہب کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے دو قومی نظریہ اور متحدہ قومیت کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے اسلامی نظام اور سیکولر نظام کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے اسلام اور کمیونزم کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے وحدتِ ملّت اور فرقہ پرستی کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے اُمتِ مسلمہ اور گروہ بندی کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے رفاقت، اُخوت اور صوبائی عصبیت کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے ایمان بر ختمِ نبوت اور ماموریت کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے قرآنی وحی اور کشف و الہام کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے قرآنی نظامِ معیشت اور سرمایہ داری، جاگیرداری اور زمینداری کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے آسمانی انقلاب اور زمینی انتشار کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے خلافت علیٰ منہاجِ نبوت اور تھیاکریسی کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے حق اور باطل کے درمیان۔

یہ مخالفت ہے قرآنی نظریہ اور غیر قرآنی نظریات کے درمیان۔

لیکن یہ مخالفت اب چند روز کی بات ہے۔ اس لئے میرے عزیزو! میرے رفیقو! میرے ہمسفرو! آپ اسی طرح ہمت کئے جائیے۔ یہ مخالفت ریت کے ذروں کی طرح منتشر ہو جائے گی۔ یہ روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائے گی۔ یہ دریا کی جھاگ کی طرح بہہ جائے گی یہ خس و خاشاک کی طرح خاکستر ہو جائے گی۔ آپ اس حقیقت پر یقین رکھئے کہ ؎

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

والسّلام